Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1967

قرآنی معاشرہ میں زمین کی حیثیت

حضرت رافع بن خدیجؓ راوی ہیں کہ انہوں نے ایک کھیت میں کاشت کر رکھی تھی کہ ادھر سے رسول اللہؐ کا گذر ہوا۔ وہ کھیت میں پانی دے رہے تھے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ زمین کس کی ہے اور اس میں کاشت کون کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بیج بھی میں ڈالتا ہوں اور کاشت بھی میں کرتا ہوں لیکن زمین فلاں کی ہے۔ اس لئے پیداوار کا ایک حصہ دے جاتا ہے اور ایک حصہ میرا ہوتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کرتے ہو۔ زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے اسے واپس لے لو۔

(۲) حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو مخابرہ کو نہیں چھوڑتا اس کے خلاف خدا و رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھو۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ مخابرہ سے کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا' زمین کو نصف یا تہائی یا چوتھائی (وغیرہ) بٹائی پر لینا دینا۔

(ابوداؤد۔ کتاب البیوع)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۱-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

چند اہم کتابیں

(۱) انسان نے کیا سوچا ؟

انسان نے وحی کی راہ نمائی کے بغیر تنہا اپنی عقل کے زور سے زندگی کے اہم مسائل سلجھانے کے لئے جس قدر کوششیں کی ہیں ۔ ان کا حقیقت کشا بیان ۔ علمی دنیا کی معرکہ آرا تصنیف ۔ قیمت مجلد (تقطیع کلاں) بارہ روپے ۔

(۲) اسلام کیا ہے ؟

اس اہم سوال کا بصیرت افروز جواب ۔ قسم اعلیٰ : آٹھ روپے
چیپ ایڈیشن : چار روپے

(۳) سلسبیل :

پرویز صاحب کے فکر انگیز ۔ انقلاب آفرین مقالات کا مجموعہ ۔
قیمت : آٹھ روپے

(۴) بہارِ نو :

مقالات کے مجموعے کا دوسرا حصہ جس سے ذہن میں جلا پیدا ہو جاتا ہے ۔
قیمت : پانچ روپے

(۵) آسمانی کتابیں :

تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی کہانی ۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں ۔ کن کن مراحل سے گذریں اور آج کس حالت میں ہیں ۔
قیمت اعلیٰ : پانچ روپے
چیپ ایڈیشن : تین روپے

(۶) عربی خود سیکھئے :

نہایت آسان زبان میں بغیر استاد کی مدد کے چند مہینوں میں عربی سکھا دینے والی کتاب ۔ قیمت : اڑھائی روپیہ

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۲۵/ی گلبرگ ۔ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ

پاکستان	ہندوستان
ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ

بدل اشتراک

سالانہ پاکستان ـــــ دس روپے

سالانہ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے

سالانہ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

جلد ۲۰ فروری ۱۹۶۷ء نمبر ۲

فہرست مضامین

(۱) لمعات ـــــــــــــــــــــــــ ۲

(۲) محشرستانِ فلسطین ـــــــ (خورشید عالم صاحب) ـــــــ ۹

(۳) باب المراسلات ـــــــ (سائنس اور خدا) ـــــــ ۴۹

(۴) نقد و نظر ـــــــــــــــــــ ۵۳

(۵) حقائق و عبر ـ (ذکرِ حسین اور ریڈیو، دین و دانش، اعلام ارزاں ہے، ہندو کے عزائم، بتائیے کس چیز کی علامت ہے، ہونے کا کنارہ) ـــ ۶۰

(۶) فکرِ پرویز ـــــــ (حسن عباس رضوی صاحب) ـــــــ ۶۵ـ۸۰

ایڈیٹر ـ محمد خلیل ـ ناشر سراج الحق ـ مقام اشاعت ـ ۲۵/بی گلبرگ لاہور ـ پرنٹر ـ شیخ محمد اشرف ـ مطبوعہ ـ اشرف پریس ـ ایبک روڈ ـ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہمارے شہروں اور قریوں سے باہر، چھوٹی چھوٹی بستیاں ہوتی ہیں جنہیں ہماری مہذب آبادی بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھا کرتی ہے۔ یہ بستیاں "چوہڑوں"[1] (خاکروبوں) پر مشتمل ہوتی ہیں، جو ہمارے مساواتِ انسانیہ اور اسلامی مواخات کے نمائشی نعروں کے تصدق، عیسائیت کی آغوش میں جانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ان بستیوں کا ماحول گندہ، ان کی فضا کثیف، ان کے رہنے والے معاشرہ کے پست ترین معیار سے بھی کم تر درجہ پر۔ زندگی کی آسائشیں تو ایک طرف، بنیادی ضرورتوں تک کے بھی محتاج، جاہل، ان پڑھ، ہر وقت فکرِ معاش میں غلطاں و پیچاں، بھلا ان کے ہاں خوشی کا گذر کہاں سے ہو اور کیسے ہو لیکن ۲۴/۲۵ دسمبر کی درمیانی شب ایسا نظر آیا گویا خوشیوں کی پریاں، ویرانوں سے اڑ کر ان بستیوں پر چھا گئی ہیں۔ سارا ماحول مسرت انگیز جذبات سے معمور ہوگیا۔ ہر گھر سے خوشیوں کے ترانوں کی نشید جانفزا ابھرنے لگی۔ یہ ساری رات غمِ دنیا سے بیخبر جشنِ طرب میں محو رہے۔ صبح دیکھا کہ ان بستیوں سے چھوٹے، بڑے، مرد، عورت، بوڑھے، جوان، اپنی اپنی توفیق کے مطابق۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ رنگین کپڑوں میں ملبوس، ہنستے، مسکراتے، گاتے، چہچہاتے، قطار اندر قطار، فرحاں و شاداں، اپنے معبد۔ گرجے۔ کی طرف چل نکلے۔ وہاں خوشیوں کے گیت گاتے، مناجاتیں پڑھیں، دعائیں مانگیں، پھر میلے لگے، جھولے پڑے، پکوان پکے، مٹھائیاں بٹیں۔ غرضیکہ انہوں نے اپنی انتہائی نکبت و جہالت اور افلاس و زبوں حالی کے باوجود، تمام وقت سے کم از کم سال میں ایک دن ایسا مانگ لیا جس میں انہوں نے جذبات کی کامل وحدت و ہم آہنگی سے قلبی مسرتوں کا سامان پیدا کر لیا۔

تین ہی ہفتے بعد، دنیا کی سب سے بڑی آزاد مسلم مملکتِ پاکستان، کی مہذب بستیوں میں سرِ شام آمدِ عید سعید کی نوید جانفزا وجہِ شادابیِ قلب و نظر ہوئی۔ سارے ملک میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، چھوٹے، بڑے، مرد، عورت، بوڑھے، جوان، سب یکسانیتِ جذبات و ہم آہنگیِ قلوب کی فردوس آفریں فضا میں ڈوب گئے۔ سارے ملک میں ایک نئی کیفیت پیدا ہوگئی۔ حساس قلوب نے اطمینان کا سانس لیا کہ جس فضا کو یہاں مستقلاً وجہِ نشاطِ روح ہونا چاہیئے تھا، کم از کم ایک دن ہی ایسا نصیب ہوا جس میں ہم اس سے لذت یاب ہو گئے۔ لیکن ابھی آنکھ بھی نہیں لگی تھی کہ چار و نطرف سے عفریتی چیخوں نے

---

[1] ہم نے یہ لفظ محض ان کے عمومی تعارف کے لئے لکھا ہے۔ اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہیں۔ قرآن کی رُو سے کسی انسان کی محض اسکے پیشے کی رو سے، تحقیر انسانیت کیخلاف سنگین جرم ہے۔ بھنگی بھی انسان ہونے کی بہت سے یکساں احترامِ انسانیت کے مستحق ہیں۔

پکار پکار کر کہنا شروع کر دیا کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو تمہیں ایک دن بھی وحدت جذبات وہم آہنگی فکر و نظر کا نصیب نہیں ہو سکتا۔ باقی شب اسی چیخ و پکار میں کٹ گئی۔ صبح عید ہو گئی صبح عید نہیں ہو گی۔ اور صبح ہوئی تو سارے ملک میں ایک ایک گھر تشتت و افتراق کا جہنم اور بعضکم لبعض عدوا۔ کا شعلہ زار بن رہا تھا۔ اس انتشار کی شدت کیسی تھی، اسکا اندازہ ہمارے ایک دوست کے جگر پاش واقعہ سے لگائیے جسے انہوں نے بامد حسرت و یاس ان مختصر الفاظ میں بیان کیا کہ ہم اپنے گھر میں صرف میاں بیوی ہیں۔ ہم میں کبھی باہمی اختلاف و نزاع کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن عید کی صبح کیفیت یہ تھی کہ بیوی روزے سے تھی اور میں عید کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس سے گھر میں جس بُعد و مغایرت کی دھول اٹھ رہی تھی اس سے دونوں کی طبیعت سخت منغض تھی لیکن غم ایسا جانگداز تھا کہ اس کا مداوا نہ میرے بس میں تھا نہ بیوی کے اختیار میں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے عمر بھر اس قسم کی تلخ نوشی کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ بار بار چاہ بابل کے ان جادوگروں کی یاد تازہ ہو رہی تھی جو صورت کے اعتبار سے تو فرشتے تھے لیکن زندگی کا مقدس مشن یہ کہ۔ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ۔ (۲/۱۰۲) کسی گھر میں میاں بیوی بھی ہم آہنگ نہ رہنے پائیں۔ عید پڑھنے کے لئے گھر سے باہر نکلے تو گلی گلی، محلہ محلہ اختلاف و افتراق کے شیاطین ناچ رہے تھے۔ عید مبارک کے تہنیت آمیز تحائف دلنشین کے بجائے گالی گلوچ کی آوازیں کان میں پڑ رہی تھیں۔ مسجد کا رخ کیا تو وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ خلقت حیران کہ کیا کریں۔ بھاگ دوڑ کر ایک میدان میں پہنچے۔ بامد دل ناخواستہ' دوگانہ ادا کیا۔ باہر سے ابھی تک یہ مقدس آوازیں فضا کو چیر رہی تھیں کہ روزے کے دن عید کرنے والے جہنم کے کندے ہیں، بے دین ہیں، کافر ہیں۔ نماز کے بعد خطرہ تھا کہ کہیں فساد نہ ہو جائے اس لئے سیدھا گھر کا رخ کیا۔ لیکن گھر میں چولھے میں آگ بھی نہیں جلی تھی۔ یوں دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت نے جشن عید منایا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مہترانی آگئی۔ اس نے کہا کہ بی بی! یہ آج کیا ہو رہا ہے؟ کچھ گھروں میں عید کی سویاں پک رہی ہیں، کچھ گھروں میں لوگ روزے سے ہیں۔ بعض گھروں میں کچھ لوگ عید منا رہے ہیں اور کچھ روزے سے ہیں۔

بی بی! ہمارے ہاں بڑے دن کو تو کبھی ایسا نہیں ہوتا!!

یہ آواز ہمارے کانوں میں پڑی اور کلیجے سے اک ہوک سی اٹھی کہ

مرا اے کاشکہ مادر نزادے!

کرنے والوں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ اب اخبارات میں مقالات شائع ہو رہے ہیں، اداریئے لکھے جا رہے ہیں، ریزولیشن پاس ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے لیڈروں کے بیانات شائع ہو رہے ہیں۔ منسٹروں تک کے تاثرات نشر ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جیالو' دورکھڑی' نہایت خاموشی سے' ایک تبسم زیر لبی کے ساتھ، خس میں ڈالی ہوئی چنگاری کی شعلہ خیزیوں کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔ ان تمام تردیدی اقدامات

میں زور اس پر دیا جا رہا ہے کہ رویتِ ہلال کمیٹی کا فیصلہ شرعاً درست تھا اور اسکی فقہی دلیل یہ ہے اور شرعی سند یہ۔ یعنی یہ سادہ لوح بزرگ ابھی تک اس فریب میں مبتلا ہیں کہ یہ ایک شرعی قضیہ تھا جس کا جائزہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے لینا چاہیئے۔

اور ہم اٹھارہ برس سے (بلکہ ۱۹۴۰ء سے) مسلسل پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ جماعت اسلامی نہ کوئی مذہبی جماعت ہے نہ اس کے اقدامات کا جذبۂ محرکہ دینی تقاضا ہوتا ہے۔ یہ اسی قسم کی ایک سیاسی جماعت ہے جس قسم کی دوسری سیاسی پارٹیاں ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ انہوں نے مذہب کو اپنی سیاسی سرگرمیوں کی آڑ بنا رکھا ہے۔ کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں مذہبی نقاب کی اوٹ میں سیاسی کامیابی بڑی آسان ہے۔ اس میں ہر شر پسندی جہاد بن جاتی ہے اور ہر تخریب کا نام اقامتِ دین قرار پا جاتا ہے۔ اس میں ہر جھوٹ کا شمار وجوباتِ شرعیہ میں ہو جاتا ہے اور ہر فریب کا جواز مصالحِ دینی کی مقدس جھاڑیوں میں تلاش کر لیا جاتا ہے۔ اس میں اپنے سوا، ہر حکومت ابلیسی قرار پاتی ہے، اور صالحین کے علاوہ ہر لیڈر فاسق و فاجر اور ہر عالم غیر معتبر۔۔۔ یہ خالص اقتدار کی جنگ ہے جو یہاں مسلسل لڑی جا رہی ہے انہوں نے پہلے، تحریکِ پاکستان کی شدت سے مخالفت کی کیونکہ اس میں (بھولے مسلمان نے) قیادت کا منصب مودودی صاحب کے بجائے، قائد اعظم کو سونپ دیا تھا۔ حصولِ پاکستان کے بعد یہ نہایت ڈھٹائی سے پاکستان آ گئے۔ حالانکہ یہ تحریکِ پاکستان کے دوران ببانگِ دہل کہا کرتے تھے کہ پاکستان میں جمہوریت کی بنیادوں پر جو حکومت قائم ہوگی وہ ہندوؤں کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی۔ یہاں آنے کے بعد، اب یہ حصولِ اقتدار کے لئے مسلسل ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان عزائم کو کبھی چھپا کر نہیں رکھا۔ وہ اس کا عام اعلان کرتے ہیں۔ مودودی صاحب نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ۔

> اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔ جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین سے فتنہ و فساد کو مٹانا چاہتا ہو۔ اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلق خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ و ناصح ہو کر کام کرنا فضول ہے۔ اس کے لئے اٹھنا چاہیئے اور غلط اصول کی حکومت کا خاتمہ کر کے غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر صحیح اصول اور صحیح طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ (خطبات ص۲۳۱)

اقتدار چھیننے کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ ملک میں مسلسل شور مچاتے رہیں کہ پاکستان اسلام کے نام سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ یہ آواز (بظاہر) ایسی معصوم و مقدس ہے کہ لوگ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس سے اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ حکومت جب بھی کوئی قانون بناتے، تو یہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ ان افرنگ زدہ "مسٹروں" (ان فاسقوں اور فاجروں) کو کیا حق حاصل ہے کہ شرعی قوانین بنائیں۔ یہ کام ان کے سپرد ہونا چاہیئے جو علومِ شریعت کے ماہر ہوں اور سیرت کے اعتبار سے صالحین۔

بالفاظِ دیگر، قانون سازی کا منصب اِن لوگوں کے سپرد ہونا چاہیئے۔ یعنی مجلس قانون ساز (پارلیمنٹ) میں، انتخاب کے راستے خواہ ان کا ایک آدمی بھی نہ آسکے لیکن قانون سازی کے آخری اختیارات اِن کے سپرد ہونے چاہئیں! (اِسکا نام اِن کی اصطلاح میں "جمہوری نظام" ہے) اس مقصد کے لئے یہ ہر حکومت اور حکومت کی مشینری کے ہر پُرزے میں برابر کیڑے ڈالتے، اور اس طرح ملک میں حکومت کیخلاف نفرت پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ کچھ مسلسل ہوتا رہتا ہے اور مختلف وقفوں کے بعد اس قسم کا قدم اٹھایا جاتا ہے جس سے اپنی قوت کا اندازہ (TEST) ہو جائے۔ عید کے موقعہ پر خلفشار انگیزی اسی قسم کا (TEST) ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ حضرات برسوں سے یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں۔ (مثلاً) ۱۹۶۱ء میں عید کی تقریب پر اسی قسم کی نزاع کے بعد مودودی صاحب امت کے افتراق و انتشار پر آنسو بہاتے ہوئے آگے بڑھے اور آئندہ کے لئے اصلاح کی یہ تجویز پیش کی کہ:

> پاکستان کے ہر ضلع میں دو عالم ایسے مقرر کئے جائیں جن کا اپنے علاقہ میں بھی اعتماد ہو۔ اور ان کے ضلع سے باہر بھی لوگ ان کو جانتے ہوں اور ان پر اعتماد رکھتے ہوں۔ اسی طرح ڈھاکہ کراچی اور لاہور میں پانچ، پانچ علماء کی ایک مجلس مقرر کر دی جائے جو عام طور پر ملک میں قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔ حکومت کی طرف سے اضلاع کے علماء کو یہ سہولت بہم پہنچائی جائے کہ اپنے شہر سے مذکورہ بالا تینوں مراکز میں سے کسی ایک مرکز پر وہ بذریعہ ٹیلیفون ہلال کے دیکھے جانے یا نہ دیکھے جانے کی اطلاع رات کے نو بجے تک پہنچا دیں۔ ان تینوں مراکز کے علماء ان اطلاعات کی بنا پر اور خود اپنے شہر اور آس پاس کے علاقوں کی اطلاع کی بنا پر یہ فیصلہ کریں کہ چاند ہوا ہے یا نہیں ہوا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت اپریل ۱۹۶۱ء)

اس تجویز میں آپ نے دیکھا کہ کہا کیا گیا ہے؟ یہ کہ (۱) یہ فیصلہ کرنا کہ چاند ہوا ہے یا نہیں، حکومت کا کام نہیں علماء کا کام ہے۔ حکومت کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ علماء کو سہولت مہیا کر دے اور (۲) علماء ایسے ہونے چاہئیں جنہیں ان کے علاقہ کے لوگ بھی جانتے ہوں اور ان پر اعتماد رکھتے ہوں اور باہر کے لوگ بھی ــــ بات بالکل واضح ہے کہ حکومت الگ ہو جائے اور یہ کام ہمارے سپرد کر دے۔ اگر حکومت نے ایسا نہ کیا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ بھی سن لیجئے۔ ارشاد تھا:

> جن لوگوں کو اس ملک میں حکومت کرنی ہے، انہیں اپنی قوم کے مزاج اور اسکی روایات کا لحاظ کرنا ہی پڑیگا۔ ورنہ بجز اسکے کہ کشمکش پیدا ہو اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (ایضاً)

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا تھا کہ ریڈیو تو حکومت کا ہو لیکن اس سے اعلان یہ خود نشر کریں اسلئے کہ:

> یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ریڈیو پر کوئی خاتون خبریں سناتے ہوئے چاند ہونے کی اطلاع دیں اور ان کے ارشاد پر ملک میں روزے رکھے اور توڑے جائیں۔ (ایضاً)

یعنی ریڈیو پر اگر کوئی خاتون یہ اطلاع نشر کرے کہ واگہ کی سرحد پر بھارت کی فوجوں نے حملہ کر دیا ہے تو اس پر تو سارا ملک اعتبار کرلے لیکن وہی خاتون اگر یہ کہے کہ رویت ہلال کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ چاند دیکھ لیا گیا ہے، تو اس پر کوئی اعتبار نہ کرے۔ وہی خاتون، رمضان کے چاند کی اطلاع نشر کرے تو اسے قابل اعتماد سمجھ لیا جائے لیکن عید کے چاند کی اطلاع قابلِ اعتماد نہ سمجھی جائے۔ رمضان کا سارا مہینہ حکومت کے بجائے ہوئے سائرن پر روزے افطار کرلئے جائیں لیکن اسی حکومت کے اس "سائرن" پر کہ کل عید ہوگی قطعاً اعتماد نہ کیا جائے۔

بہرحال مودودی صاحب نے ۱۹۶۱ء میں یہ تجویز پیش کی لیکن حکومت نے اس قسم کی کمیٹیاں نہ بنائیں، اس لئے سمجھ سکتے کہ کشمکش پیدا ہو اور کیا حاصل ہو سکتا تھا! چنانچہ وہ کشمکش پیدا کی گئی اور سال گزشتہ عید کے موقعہ پر اسے شدت تک پہنچا دیا گیا۔ اس پر حکومت نے رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل جدید کی اور اس میں ایک عالم کو بھی شامل کر لیا گیا۔ لیکن یہ کمیٹی، ان حضرات کو کس طرح مطمئن کر سکتی تھی؟ اس میں دو نمائندگان حکومت کے تھے (ایک مرکزی وزیر اور ایک مرکزی سکرٹیری)، اور جو عالم دین شامل کیا گیا وہ جماعت اسلامی سے متعلق نہیں تھا۔ لہذا، اس کشمکش کا جاری رکھا جانا ضروری تھا۔ اسے جاری رکھا گیا اور اس سال اسے زیادہ منظم طریق سے بروئے کار لایا گیا۔ یہ طریق کس قدر منظم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریڈیو سے چاند ہو جانے کا اعلان سرِ شام ہوا۔ اس کے بعد گیارہ، بارہ بجے کے درمیان، ہر مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے، تمام ملک میں، بیک وقت، یہ اعلانات شروع ہو گئے کہ کل عید نہیں ہوگی۔ اور یہ اعلانات صبح تک ہوتے رہے (پاکستان ٹائمز میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق) اس امر کے مطبوعہ اشتہارات بھی راتوں رات تقسیم ہو گئے) صبح لوگوں نے دیکھا کہ مسجدوں میں تالے پڑے ہوتے ہیں اور ائمہ مساجد غائب ہیں۔ تھے ان کے پروپیگنڈا کی مشینری کا عالم، اور اس پر بھی مودودی صاحب گلہ مند ہیں کہ انہیں پبلسٹی کے ذرائع میسر نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے حالیہ بیان میں نہایت معصومیت اور مظلومیت کے ساتھ فرماتے ہیں۔

> ہمارے پاس کوئی ذریعہ ملک کے لوگوں کو خبر پہنچانے کا نہیں تھا۔ ریڈیو کو ہم استعمال نہیں کر سکتے تھے شہر میں مساجد کے لاؤڈ اسپیکر سے بھی کم ہی اعلان کیا جا سکا۔ اس وجہ سے وہ افراتفری رونما ہوتی جو کل دیکھی گئی۔ (مشرق۔ ۱۴۔ جنوری ۱۹۶۷ء)

اس طرح ملک بھر میں، نہایت منظم طریق پر خلفشار پیدا کرنے کے بعد، مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یاد رکھو! جب تک تم میری وہ بات نہیں مانو گے جو میں نے ۱۹۶۱ء میں کہی تھی۔ ملک میں اسی طرح خلفشار پیدا ہوتا رہے گا۔

چنانچہ انہوں نے (جمعہ کے دن) اپنے خطبہ عید میں اپنی اس تجویز کو پھر یہ کہہ کر دہرایا کہ:

> رویت ہلال کے اعلان کے بارے میں صحیح انتظام کرنے کے لئے ہر ضلع میں رویت ہلال کمیٹیاں قائم کی جائیں جن کے اندر قابلِ اعتماد علماء کو شامل کیا جائے۔ اسی طرح مرکزی رویت ہلال کمیٹی

میں بھی ایسے لوگوں کو شامل کیا جاتے جو اپنے دین اور اخلاق کے لحاظ سے لوگوں میں قابل اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔　　(ایضاً)

یہ ہے سارا قصہ اس "مقدس دینی فریضہ" کا جس کا احساس مودودی صاحب کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا یعنی یہاں حکم میرا چلے گا حکومت کا نہیں۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو میں تمہارے پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا! وہ اپنے مقصد و موقف کو اس دھڑلے سے بیان کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے ارکان حکومت اور اکابر ملت ہیں کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ یہ جماعت کس طرح ملک میں انتشار پھیلا رہی ہے" ادم شانتی۔ ادم شانتی" کے اپدیش سے آگے نہیں بڑھ رہے۔ (مثلاً مرکزی وزیر مواصلات، عبدالصبور خان صاحب، کے متعلق حسب ذیل خبر" روزنامہ مشرق کی ۵ ارجنوری کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔

> خان عبدالصبور خان نے ان سیاست دانوں کو متنبہ کیا ہے جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے ذہنوں میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مقامی جماعت اسلامی کے راہنماؤں کی ناپاک سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان راہنماؤں نے کل عید کے اجتماعات سے خطاب کرنے کا فائدہ اٹھاتے ہوتے اپنے سیاسی نظریات عوام کے ذہنوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی ہر وقت پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کے درپے رہی ہے لیکن اس قسم کے ناپاک عزائم کو ناکام بنا دیا جائے گا۔

(اسوقت ناکام بنا دیا جائے گا جب یہ ملک کو تباہ کر چکی ہوگی) رویت ہلال کمیٹی کے صدر، وزیر دفاع و امور داخلہ، وائس ایڈمرل اے۔ آر۔ خان نے اپنے بیان میں کہا ہے۔

> مجھے افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے ذاتی اغراض کے لئے رویت ہلال کی صداقت کے بارے میں شبہات پیدا کر دیئے میں اپنے پاکستانی بھائیوں سے درخواست کرونگا کہ وہ ان لوگوں کو نظر انداز ہی کریں۔　　(مشرق۔ ۱۴/۱ ۶۷)

(کیونکہ ہم اس معاملہ میں بے بس ہیں!) مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر، ملک خدا بخش صاحب کی طرف سے اس سلسلہ میں ایک طویل بیان شائع ہوا ہے لیکن اس میں خاص طور پر اس امر کی احتیاط کی گئی ہے کہ کہیں بھی جماعت اسلامی یا اسکے امیر کا نام نہ آنے پائے۔

بعض لوگوں کو ہم نے یہ بھی کہتے سنا ہے کہ "دین کا معاملہ ہے اس میں جبر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ موضوع بڑا اہم اور الگ ہے کہ لاإکراہ فی الدین کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس پر ضمناً کچھ لکھنا موزوں نہیں۔ اسوقت ہم صرف اتنا کہنے پر کفایت کرتے ہیں کہ اگر مروجہ عائلی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے کو مستوجب سزا قرار دینا مداخلت فی الدین نہیں، تو رویت ہلال کے متعلق حکومت کے فیصلے کے خلاف اعلانات کرنے والوں پر مواخذہ کرنا بھی مداخلت فی الدین قرار نہیں پا سکتا اور اس کے لئے ہم خود مودودی صاحب کی شہادت پیش کئے دیتے ہیں۔ ملیشیا میں (اسلامی نقطۂ نگاہ سے) اسی قسم کی حکومت

قائم ہے جیسی پاکستان میں جس روز یہاں عید کا خلفشار پیدا کیا جا رہا تھا، اتفاق سے اسی روز مودودی صاحب کا رسالہ ترجمان القرآن (بابت جنوری ۱۹۶۷ء) ڈاک میں موصول ہوا۔ اس میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ملیشیا میں اسلامی حکومت کا نفاذ"۔ اس اسلامی قانون کی ایک شق حسب ذیل ہے۔

> ریاست ہائے سیلانگر، پہانگ، نیگری سیمبیلن، ملکا، پینانگ، کیدہ، پرلس اور پیرک میں آغاز رمضان اور عیدین کے سلسلہ میں قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حکمران کے قانونی حکم بسلسلہ آغاز رمضان یا عیدین کی نافرمانی کرے تو اسے پچیس ڈالر جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔ پیرک میں پچاس ڈالر تک جرمانے کی سزا یا پندرہ دن تک قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

اگر ملیشیا کے حکمران کے حکم کی خلاف ورزی پر مواخذہ مداخلت فی الدین نہیں بلکہ (خود ترجمان القرآن کی شہادت کی رُو سے) اسلامی قانون کے عین مطابق ہے تو پاکستان میں حکومت کے فیصلہ کی خلاف ورزی پر مواخذہ کس طرح مداخلت فی الدین متصور ہو گا؟ ایک طرف تو ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست میں کوئی امتیاز نہیں اور دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں معاملہ دینی ہے اس لئے اس میں دست اندازی مداخلت فی الدین ہے۔ اور فلاں سیاسی جس کی خلاف ورزی پر گرفت ہو سکتی ہے۔ یہ ہے ہمارے اربابِ دانش و بینش کی ذہنی حالت۔ (اس موضوع پر ہم تفصیل سے کسی دوسرے وقت لکھیں گے) باقی رہا چاند دیکھنے کا سوال تو یہ فی نفسہٖ نہ دینی ہے نہ سیاسی۔ یہ کیلنڈر متعین کرنے کا انتظامی سوال ہے۔

بہرحال، یہ ہیں جماعتِ اسلامی کے عزائم اور وہ مقاصد جن کے حصول کے لئے مذہب کو سپر بنایا جا رہا ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ جماعت روزِ اول سے تحریکِ پاکستان کی مخالف رہی ہے۔ اور اب اس کا موقف یہ ہے کہ اگر مملکت کا اقتدار انہیں حاصل ہو سکتا ہے تو ھو المراد، ورنہ بھاڑ میں جائے پاکستان اور چولھے میں پڑے یہاں کی مملکت۔ ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ طلوعِ اسلام کے قارئین کے حلقہ میں روز بروز بکثرت اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس محفل کے نو واردان کے لئے شاید یہ باتیں نئی نئی سی ہوں، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر ایک جامع و مانع مفصل مقالہ شائع کرنا ضروری ہے۔ سرِدست ہم ملک کے اربابِ دانش و بینش کی خدمت میں صرف اتنا گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ یہ جماعت ملک و ملت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اس کے سامنے صرف اپنے مفاد ہیں۔ اگر اسے اسی طرح کھل کھیلنے دیا گیا تو یہ یہاں بھی وہی کچھ کرے گی جو اخوان المسلمین نے عرب ممالک میں اور مسجومی پارٹی نے انڈونیشیا میں کیا ہے یا جو کچھ اس وقت بھارت میں گئو رکھشا کی آڑ میں کیا جا رہا ہے۔ جب سیاست، مذہب کی اوٹ میں آتی ہے تو پھر کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں رہا کرتا۔ فھل من مدّکر

محترم خورشید عالم

لیگئے شلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ

(محشرستانِ فلسطین)

اہل فلسطین خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر سکے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی الجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل سابقہ پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشۂ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روشن ہو جاتے گا کہ ایسا ناگزیر تھا۔

بین الاقوامی جنگاہ منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا، اور جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا گمان تک بھی نہ تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصۂ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر فلسطین۔ معلوم دنیا میں قومیں ابھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، وادی سندھ، اسیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما، ان اقوام کے عروج و زوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑہ کو بے دردی سے روند ڈالتے رہے۔ اس کے حیات و مطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دیئے جاتے　　فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا، کہ وہ اس کا حلیف ہو یا

اُس کا حریف، وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین بین الاقوامی، تجارتی قافلوں کی گذرگاہ تھا اور جنگ کے زمانہ میں عساکر و جیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہو جاتا۔ اس کی قومی آزادی و خود مختاری، ناقابلِ حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے فلسطین کسی ایک طرف ہو کر پانسہ پلیٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہلِ فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کر دیتی لیکن یہ اہمیت خطرناک تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

آلِ اسرائیل

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی، اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Judah) تھا یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ (Judah) میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے اُنھیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی۔ چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والدِ بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس[1] یہ مصر میں رہے۔ پھلے پھولے، بڑھے، پھولے پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا، اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعونِ مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اُس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے اُنھیں کچلنے کی ٹھان لی چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ بنی اسرائیل کی کثرت کو روکنے کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں حضرت موسیٰؑ، کہ آلِ اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس عالم میں دارالسلطنت میں پیدا ہوئے جبکہ بنی اسرائیل کے بچوں کی ہلاکت کا انسانیت کش حکم نافذ تھا۔ مشیتِ ایزدی نے آلِ اسرائیل کے اس فرزند کو نہ محض ہلاکت سے بچایا، بلکہ شاہی محلات میں اس کی پرورش کا سامان کر دیا اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹ کر انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسےٰ کے بعد یوشع کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور قدیمی باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا جدید مورخین اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے کہ قدیمی باشندے بالکلیہ نیست و نابود ہو گئے۔ ان کا خیال ہے

[1] یہ ہنوز محلِ نظر ہے۔ (طلوعِ اسلام)

کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے بلکہ مفتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ جی ویلز نے اپنی کتاب The Outline of History میں لکھا ہے۔

> یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین The Promised Land کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلاف واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ Philistines جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمالی میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

اسرائیلی شبانی اور زرعی عادت کے مالک تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا، ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکان زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل ـــ شہروں میں بسنا، مالیات و تجارت میں مہارت وغیرہ ـــ ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی سفک دم کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی معمار۔ حضرت سلیمانؑ کے تزک و احتشام کے باوجود عہد نامہ عتیق کی داستان، مکانات اور محلات کے بجائے گیہوں، انگور، زیتون، بھیڑوں اور بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام 'شبان' (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمان آلِ اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی مرتبہ گیارہویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی میں بیت المقدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ان کی شوکت و ثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں "سلطنت اسرائیل" کا قیام کیا۔ باقی دو یعنی جوڈہ اور بن یامین کے قبائل بدستور جنوب میں تخت داؤد کے وفادار رہے۔

تباہی کی داستان

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلا جرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ

لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۔ (۱۷/۴)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دے دی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ کوئی ۷۲۱ ق م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے تاریخ ان کے انجام کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی صدی بعد بابل کے شاہ بخت نصر نے "جنوبی حکومت" کو تہ وبالا کر دیا۔ یروشلم کی کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا، اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ قتل و غارت گری سلب و نہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت ہی تباہ ہوئی، بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی و محکومی، ہلاکت و بربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آ سکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودیوں کے انبیاء ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا۔ جب ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحر روم کا درمیانی علاقہ فتح کر لیا اور یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شاہ یا شاہان فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سرِ نو تعمیر کی بھی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۵۳۷ سے ۵۱۵ ق م کے دوران میں ہیکل پھر تعمیر ہو گیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔

فارس کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے ۳۳۲ ق م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کا ملاً مسلوب کر لی۔ ۳۲۰ ق م میں بطلیموس Ptolmy نے مصر کے راستے حملہ کیا۔ اور یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔ حتیٰ کہ ۱۶۳ ق م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہو گئی جن کا ذکر صحفِ یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے، پامپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں تقریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ ۱۵ ق م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے۔ اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقعہ دیا گیا اور ان میں حضرت عیسےٰ مبعوث ہوئے

لیکن یہودیوں نے حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمامِ حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ رومیوں نے ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد آج تک یہ قوم دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں ذلیل و خوار رہی ہے۔ "قبل مسیح" بعد مسیح میں بدل گیا۔ لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی۔ ۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرین HADRIAN نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کر دیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکالکر چار دانگِ عالم میں بکھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہو گئے اور وہیں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً، قطرہ قطرہ، فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔ ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ دیارِ وطن، تھی اور ایک حد تک یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہوواہ Jehovah نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ 'دشمن' کی فتوحات اور اپنی 'شکستیں' "تقدیر" کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزو سے 'وطن' مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال PASSOVER کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ "آئندہ سال یروشلم میں"

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساختہ ہیں۔ انھوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ وہ تاریخ سے بنے ہیں جب صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد ارضِ مقدس و موعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابلِ ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انھوں نے نہ کلچر کو ترقی دی، نہ تہذیب و تمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور تشخص قومی کا دور مختصر اور ناقابلِ رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی، اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ کوئی نہ کوئی غارت گر آپہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی ہے تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ شاہ فارس سائرس نے ہر چند انھیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دے دی لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا، اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہی اصلی یہودی نہیں تھے۔ ان کا تشخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے لئے ظلم و استبداد کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر اقوام کا تختۂ مشق بنتے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوجود کہ حضرت مسیحؑ یہودی تھے اور ان کے اولین حواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنانِ مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ

عجیب و غریب حقیقت ہے کہ عیسائیت یہی یاد رکھ سکی کہ مسیح کو مصلوب کرنے کے ذمہ دار یہودی تھے ۔ وہ یہوڈا سکریوطی Judas Iscariot کو تو یاد رکھ سکی لیکن خود اپنے بانی حضرت مسیح، جان اور پال کو بھول گئی۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے جیل خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے علاوہ کوئی راہ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انھیں طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں، اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پیس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ قومی سزا اس ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلاب فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا۔ اور خیالات و نظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۹۱ء یہودیانِ یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں روس کے علاوہ ہر جگہ ان پر سے پابندیاں ہٹا دی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے، گاڑیوں میں سفر کر سکتے تھے، زمین کے مالک بن سکتے تھے۔ اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادانہ کام کر سکتے تھے۔ اسکے باوجود شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ملک ہو جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ نفرت پائی ضرور جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے، وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا۔ اور اس احساس تقدس کا مظہر وہ Passover کی سالانہ ضیافت تھی۔ جہاں "آئندہ سال یروشلم میں" کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس امید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان Temple of Solomon کی ازسرِنو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ کیونکہ ہیکل سلیمان کی جگہ مسجد عمرؓ استوار ہے۔ ایک کی تعمیر دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ سلیمان کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں "تبدیلی" نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر، بلکہ ان کے نزدیک یہ سلسلہ مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک، تعمیر مسجد غصب ہے۔ وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس نزاع خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے عہد میں یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے لے کر

۱۹۱۷ء تک کہ جنرل ایلن بی نے ترکوں سے اسے فتح کیا۔ سوائے اس عرصہ کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت کا قیام کیا فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں عربی قوت و شوکت ان کی قبائلی عصبیت لہٰذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارہویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے۔ اور خلیفۂ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انھوں نے ۱۰۷۱ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۰۷۵ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوتِ مقدس تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی۔ تاکہ "کافر" ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۰۹۹ء میں پاپائیانِ یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اُسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت و خون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوؤں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ ۱۱۰۰ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۱۶۹ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قوتوں کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آ سکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانی کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ان کے بعد ترکانِ عثمانی اٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا تک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الغا ۱۹۲۳ء میں مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلن بی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیشِ نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

صیہونیت جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بیچارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوتوں استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر یہ ناگزیر تھا۔ تمام قوتیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربوں کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح "نئی آبادیوں" کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ بلکہ مسرفانہ خرچ

کیا جا سکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیراتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترکِ وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راتھس چائلڈ اور دوسرے سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالمگیر یہودی جدوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین میں یہودیوں کا تناسبِ آبادی بمشکل پانچ فیصد تھا جو پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز تک سات فیصد سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب دس فیصد تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشا استعمال کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اول تک مکمل عربی ملک تھا۔ کیوں کہ عرب آبادی نوے فیصد تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی چار و ناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکینِ وطن کی حقیر سی تعداد عازمِ فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن 'محبانِ صیہون' Chovevei Zion قائم ہوئی جس نے یہودی تارکینِ وطن کا رُخ سوئے فلسطین پھیرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک آسٹروی صحافی Theodor Herzel نے صیہونی سوسائٹی Zionist Society قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی اسٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی اسٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ ۱۹۰۳ء میں جب برطانوی حکومت نے یوگنڈا Uganda کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیشکش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کر دی۔ اس وقت ہرزل کا انتقال ہو چکا تھا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق

فلسطین پر یہودی استحقاق بنایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدت کے لئے حکمران رہے۔ اس زمانۂ اقتدار میں ہر چند انھوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں صرف مغلوب کر سکے فلسطین سے ختم نہ کر سکے، نہ اکھاڑ کر پھینک سکے۔ اس مختصر دورِ حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و مسکنت اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کر سکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے یا اس جذباتی وابستگی سے جو وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں فلسطین سے ہے۔ تاریخ و سیاست اول الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک

کسی قوم کی تحویل میں اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہدِ ماضی میں وہ اس پر فرمانروا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیلِ بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حق ملکیت کے حق میں دیجا سکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہیئے، نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمران رہے ہوں، یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوتے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے جائز مالک ہیں۔ لیکن عربوں کے حق میں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں رہے اور اس کے بدستور مالک ہیں۔ ان کے ہاں انتقالِ ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک فلسطین سے یہودیوں کی جذباتی وابستگی اور "آئندہ سال یروشلم میں" کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسم کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوتے ہیں وہ، وہ ہیں جنہیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے۔ اور جنہیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب بھیجا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترکِ وطن کر کے فلسطین میں نہیں آجاتے؟ کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنھوں نے فلسطین میں پناہ لی، کم ایماندار یہودی ہیں۔ بات صاف ہے۔ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم و تعدی نہیں ہو رہا، اس لئے آئندہ سال یروشلم میں" میں دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں آکر آباد نہیں ہوتے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہیں، بلکہ خصوصی اغراض و مصالح سے انہیں عرب مظلومین پر ٹھونسا جا رہا ہے اور عربوں کو آبائی وطنوں سے نکالا جا رہا ہے اس طرح ان بدبختوں کے لئے اور مصیبت پیدا کی جا رہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ٹھونسنا، حملہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرات موسیٰ اور عیسیٰ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی اول الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس تین حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنھیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہٰذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ فلسطین مسلمانوں کا قبلۂ اول[ط] ہے۔ لہٰذا وہ عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا مذہبی مرکز رہ چکا ہے۔ اس خاک کا ذرہ ذرہ مقدس ہے کہ وہ عروج و زوالِ اقوام کی الٰہی مشیت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔

ط یہ روایت محلِ نظر ہے۔ (طلوعِ اسلام)

مسلمان نے اس رشتۂ عزیز کو ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھا اور اسے جان سے عزیز تر رکھا۔ اب وہ اسے ہاتھ سے جانے دے سکتا ہے؟ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دو نیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں۔ زندہ قوموں کا ہر مرحلہ ہوتا ہی فیصلہ کن ہے!

عرب

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گمشدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ ربط قائم کرنے کے لئے ہم مختصراً تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دورِ حکومت میں عالم عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان میں بیداری کے آثار ۱۷۶۰ء سے شروع ہوتے ہیں جب اس تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی جسے وہابی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کیلئے سیاسی غلامی کا باعث سمجھی یا سمجھائی جانے لگی تھی، اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات بیدار ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے اُن کا رُخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ ۱۸۷۵ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقاء میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم، عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرقِ وسطےٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قوتوں کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ برصغیر پر قابض تھا، وہ انگلستان سے برصغیر تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحر روم اور بحر قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (۱۸۳۰ء) اور ٹیونس (۱۸۸۱ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرقِ وسطےٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحر روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگِ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دیئے۔ یہ سلسلہ جنگِ عالمگیر تک جاری رہا اور ممالکِ اسلامیہ استعمارِ فرنگ کا یا

براہِ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیرِ اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی 'مردِ بیمار' بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافتِ اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالکِ اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے یہ وابستگی جذباتی تھی لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف شکایات تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قوئ مغرب کی باہمی رقابت تھی آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ عمومی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریلیا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام (کلاں) یا ممالک عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں تک پر تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدِ باب اشد ضروری تھا۔ کچھ کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۴ء میں وہ حسین ابن علی 'شریف مکہ' سے اسکے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ

عرب، خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ حسین، شریفِ مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدتِ عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پُر امید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچنر، سٹارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروفِ گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا، تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدہ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس، حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفسطاط، الاحد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے کیونکہ وہ ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھا رہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز، ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں پیہم شکستیں اٹھاتے جا رہے تھے۔ اب موقع تھا کہ عالمِ عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیرِ اثر کیا جائے تاکہ انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جا سکے۔ ایسے میں رسوائے عالم میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحرِ روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرق اردن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے انہیں تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حماہ اور حلب Aleppo کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ

علاقے خالصتہً عربی نہ تھے۔ اس "مغرب" کی بعد میں یہ توجیہہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا۔ خود میکموہن نے ایک مرتبہ لنڈن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحیرہ روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آجاتا تھا۔ اگر بغرض استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے ایسی دور از کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کریگا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا۔ اس کی عرب آبادی نوّے فیصدی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدتِ عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا تھا۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی "استعمال" کرتا۔ توہین جائیدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حق ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردود نظریہ کو اساسِ گفتگو نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ طرزِ استدلال غمازی کرتا ہے کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ابی سینیا پر اٹلی کا حق ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انھوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران میں عربی جذباتِ وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں سے بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے۔ اور ترکی عساکر کا سلسلہ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربوں کی امداد بے بہا تھی۔ لائڈ جارج نے موتمرِ امن (۱۹۱۹ء) میں اعتراف کیا۔

> شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے کے لئے کیا کیا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل

اقتباس سے لگائیے۔

ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کی چھتوں کی ٹائلیں بھی بکنا شروع ہو گئی تھیں ..... (یہ حالت جولائی ۱۹۱۸ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک و شبہ سے مبرا ہے کہ جنگ کے دوران میں تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نذرِ اجل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئی۔ (The Arab Awakening)

عربی آزادی

عرب مسلمان تھے۔ انہوں نے ترکی دعوتِ جہاد کی کیوں پروا نہ کی؟ لارنس کے الفاظ میں :-

دورانِ جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب تھی، بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انہوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکیں تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری، بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔　　(لارنس کے خطوط)

ترکوں کے دور نے عربوں میں بہت حد تک جذباتِ قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہدِ ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرقِ وسطےٰ سے ان کو بے دخل کر دیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر مشرقِ وسطےٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لئے مشرقِ وسطےٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کرنا تھا، اس لئے وعدوں کی معقولیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مصیبت میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکتِ جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا، اس کا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست ۱۹۱۵ء میں حسین کو لکھا :

لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے جس میں ہماری ممالکِ عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

خفیہ معاہدہ

مئی ۱۹۱۶ء میں جب عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس)، کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا عربی وفاق کے موید ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے معاہد ممالک عربیہ کو حلقہ ہائے اثر (برطانوی اور فرانسیسی) میں تقسیم کرنے میں اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رُو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے! معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود فرانس سے یک طرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس، پیکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمار فرنگ کی یہ بداخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مسائل کی کہ ان میں سے اہم فلسطین ہے، علت العلل ہے۔ جب ۱۹۱۷ء میں روس کی اشتراکی حکومت نے اس خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا۔ اور حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شر انگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزمِ مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلالِ عربیہ کی تشکیل و تقویم کریگا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین سے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی، جس کے جواب میں وزارتِ خارجہ (برطانیہ) نے (The Declaration to Seven) شائع کیا۔ اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا۔

> جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں، ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا

> مشرق وسطےٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیش نظر مقصد اُن لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی (Complete and final liberation) ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آتے ہیں۔ نیز ایسی

قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی
برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظامِ حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ
ایسی مؤثر امداد دیں گے جس سے وہ حکومتیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک 'بدعت' تھی جو جمعیت اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کیطرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا، نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق حسین کے بیٹے، فیصل کو بخش دیا گیا، شرق اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو، شام، فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں۔ کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران میں عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے متشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامرِ مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات و حسیات کو ٹھکرایا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے۔

فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی۔ تاکہ وہ میسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س پ ــــ معاہدہ کی رُو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو حلب، حما، حمص، دمشق اور شرق اردن۔ انتداب کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ س پ۔ معاہدہ تحدیدیں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حقِ خود مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

اعلان بالفور

برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے ان سے رنگا رنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں کہ جس کے سیاسی پسِ منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرقِ وسطےٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو

کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھاتے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا، نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریک جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائزمین، صدر ذائنسٹ ایسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیاداں وائزمین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائزمین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الجھنوں کا حل اعلان بالفور ہے جو ۲ر نومبر، ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا:

> ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظر استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کریگی کہ اسکا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح ہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلان بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب وغریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتام جنگ پر نوتے فیصدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے۔ ایسی اقلیت کہ اسے 'غیر یہودی فرقہ' کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین وسیاست دان عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے تھے۔ فلسطین کے اوّلین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض ومتمکن چلے آرہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فیصدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جا سکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال بیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدس ملک پر تسلط جما سکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس لئے جرمنی کا ملک دیا جا سکتا

ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو دیں وجہ بخشا جا سکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا۔؟

یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت بہرکیف اعلان بالفور نے 'قومی وطن' کا وعدہ کیا، نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطے کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصہ میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ 'قومی وطن' ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہٰذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کر دیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ خیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وائزمین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑکی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین و قانون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبطِ تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء و رضامندی کے خلاف مسلط کئے جا سکتے ہیں؟

شاہ فیصل نے اعلانِ مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا:

> بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کر لیں۔ ..... لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہو گئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہو جائیگا۔ اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہ نہیں رہوں گا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اعلان بالفور عربوں کی آزادی میں منتج ہو تو قابلِ عمل' ورنہ بے کار، ناجائز، ساقط العمل'۔ اس اعلان نے یقیناً عربوں کو آزادی نہیں دلائی بلکہ انہیں اور پابندِ سلاسل کر دیا۔ لہٰذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلف نہیں ـــــ لہٰذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساسِ مذاکرات بنانا یعنی چہ!! اس کے بعد معاہدہ لوزان (۱۹۲۳ء) کی رُو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالفور پر استوار تھی۔

برطانوی وعدے یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران میں ان کی امداد و تائید حاصل کرنے کے لئے

برطانیہ نے عربوں سے بھی وعدے کئے اور یہودیوں سے بھی۔ یعنی پہلے عربوں سے اور پھر یہودیوں سے۔ یہ وعدے یا تو ایک دوسرے کی ضد ہیں یا باہمی طور پر مطابق۔ اگر متضاد ہیں تو اخلاقاً اور قانوناً وہ وعدے قابلِ قبول و عمل ہیں جو پہلے کئے گئے۔ کیونکہ ایک قانونی ضمانت دے دینے کے بعد انگریز اس سے متضاد وعدہ کسی اور فریق سے نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا برطانیہ کے وہ وعدے جو یہودیوں سے کئے گئے اور عربوں سے کئے گئے، وعدوں کی ضد ہیں، غیر قانونی اور قابلِ استرداد ہیں۔ اگر وہ وعدے ایک دوسرے کے مطابق ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنی آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں اور انگریزوں کا ہرگز یہ منشاء نہیں تھا کہ کسی عرب ملک میں کسی غیر عرب (یہودی) کی سلطنت قائم کریں یا اسے بزورِ شمشیر مسلّط کریں۔ اس سے فیصلہ انتداب بھی غلط ہو جاتا ہے اور فیصلہ تقسیم بھی۔ اگر تینوں فریقوں یعنی برطانیہ، عربوں اور یہودیوں میں سے کوئی ان وعدوں کا مفہوم کچھ اور لیتا ہے تو اس کے حل کی بہترین صورت یہ ہے یا تھی کہ تحریری دستاویزات کو، کہ وہی وجہ نزاع ہیں، بین الاقوامی عدالت میں برائے فیصلہ پیش کیا جاتا۔ برطانیہ نے ایسا کرنے کی بجائے معاملہ جمعیۃ اقوامِ متحدہ کے سپرد کیا جس نے عربوں کی مرضی کے خلاف برطانوی وعدوں کو ٹھکراتے ہوئے فلسطین (اور بعض دیگر عربی ممالک) کو انتداب کی لعنت میں گرفتار کر دیا۔ جمعیۃ اقوام ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ معاہدہ امن کی خبر پا کر عربوں نے جولائی ۱۹۱۹ء میں دمشق میں ایک موتمر طلب کی۔ اس موتمر کی قراردادوں میں ہے۔

> ہم جنوبی شام میں جس کو فلسطین کہا جاتا ہے، یہودیوں کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہیں کہ وہاں یہودی دولتِ اشترکہ (Jewish Commonwealth) قائم ہونی چاہیئے ہم یہودیوں کے داخلہ فلسطین کے ہی مخالف ہیں۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا ایسا حق ہے اور ہم ان کے مطالبات کو اپنی قومی، سیاسی اور معاشی زندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے (موجودہ) یہودی شہری ہماری طرح ملکی حقوق و فرائض میں بدستور شریک رہیں گے۔

ممالکِ عربیہ میں عام جذباتِ نفرت پھیل گئے۔ ان کا خون، ان کی قربانیاں، سب اکارت گئی تھیں عربی حمیت، قومی خودداری کی یہ تذلیل کب دیکھ سکتی تھی؟ انہوں نے بچے ذبح کرائے، جوان قربان کئے، مصیبتیں جھیلیں، ملک برباد کرائے، اس امید پر کہ وہ آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ لیکن اس سرفروشی اور ایثار پیشگی سے ملا تو کیا؟ — غلامی! لعنت و ذلت!!

فیصل نے تنگ آ کر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا جو جملہ امور کی تحقیقات کرے۔ برطانیہ اور فرانس کو اپنی شفیت کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا علم تھا۔ انھوں نے اس منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ امریکہ نے کہ اس وقت تک غیر جانبدار تھا، اس کا خیر مقدم کیا۔ نتیجہ کنگ، کرین رپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ رپورٹ اس لئے قابلِ ذکر

ہے کہ غیر جانبدار اشخاص کی مرتب کردہ ہے۔ اس رپورٹ میں متشدد صیہونیوں کی مذمت کی گئی جو غیر محدود داخلہ فلسطین پر مصر ہیں۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قومی وطن قومی حکومت نہیں۔ ایسا کرنا غیر یہودی فرقوں کے مدنی اور مذہبی حقوق کو پامال کئے بغیر ناممکن ہے۔ واضعین رپورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ ابتداً یہودیوں کے حامی تھے۔ اسکے باوجود حقائق و واقعات کا مطالعہ کرکے انھوں نے موتمر امن کو مشورہ دیا۔

یہودیوں کا داخلہ فلسطین یقینی طور پر محدود ہونا چاہیئے اور فلسطین کو یہودی دولت مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیئے۔

خلاف صیہونیت تحریک

۱۹۱۹ء کے بعد حالات کی رفتار بدل گئی کیونکہ ہمہ گیر خلاف صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابق وطن ترک کرکے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکین وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رُخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی سوسائیٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھایا اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسر اقتدار آیا۔ ہٹلر پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہذا آئندہ تیاری سے پیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے ساتھ ساتھ خلاف صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فی صدی تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد پچیس ہزار سے پانچ لاکھ اناسی ہزار ہو گئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوئے۔ انھیں ڈر ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں ہو جائینگے اور ان کا ملک یہودی ملک ہو جائے گا۔ یہودیوں نے سرمایہ کے زور سے غریب عربوں کی زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں اور بساتے تھے ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیر اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلہ میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انہیں آبائی گھروں سے نکالا گیا ہے اس لئے انہیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ عرب خود سامی النسل ہیں۔ لہذا یہ ناممکن ہے کہ وہ بھی نام نہاد "اینٹی سامی" تحریک کے علمبردار بن جائیں۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدردوں اور بہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر ٹھونسا ہے اس سے "سامی دشمنی" کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے

عرب کبھی (سامیوں) (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انھوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہونگے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ فراخدلانہ، برادرانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے، جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا، ان کی جانیں ضائع ہوئیں، انہیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ ہمدردانِ یہود نے یہودیوں کو (سامی دشمنی) کے یورپی حلقے سے نکال کر عربی حلقہ میں جھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی، اسے محبانِ اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی اسی آگ میں جل رہے ہیں۔

انتدابِ فلسطین

انتدابِ فلسطین "اے کلاس" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اسے نگرانی میں رکھا جائے گا۔ انگریز کی یہود نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی جا رہی ہے۔ اس کی کیا ضمانت تھی کہ یہ سلسلہ اس وقت رُکے گا جب فلسطین یہودی بن چکا ہوگا۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا اعرابِ فلسطین آزاد ہو سکیں گے؟ ۱۹۲۶ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کمشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہودی ہر چند اقلیت میں تھے لیکن ان کے نمائندے برطانوی پارلیمان میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ حقیر سی کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے ببانگِ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے، معاملات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رَو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی حقیقی وجوہات تھیں، اس لئے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن کا قیام کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا ماحصل یہ تھا کہ انتداب ناقابلِ عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصے عطا کر دیئے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی۔ فلسطین کی تقسیم! سابقہ پنجاب کے بمشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتدا قومی وطن سے ہوگی اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکاتِ مذبوحی سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی

بیس لاکھ ہے اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ غیر ذی زرع صحرائی ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دوگنی یعنی چالیس لاکھ ــــ یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ سارے کا سارا قطعہ زمین بھی یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا جمِ غفیر یقیناً اس مختصر سے قطعۂ ارض میں نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو بھی یہودی اس میں نہیں سما سکتے۔ اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے بہانہ سے عربوں کو کچلا نہیں جا رہا؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما بھی جائیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرانے والے کون؟ انھیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا ہے؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور بنی نوعِ انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعائے ہمدردی انسان اس وقت کس غار میں جا چھپا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یوپی اور کشمیر کے بیکس اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا؟ اس تاریخ میں فقید المثال قتل عام کی زد اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود اقوام متحدہ خاموش رہی اور ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ مہاجرین فلاکت زدہ، لٹے لٹائے پاکستان پہنچے۔ کسی کو یہ قیامت دیکھ کر خیال نہ آیا کہ ان مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہی آباد کرا دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ یہودیوں کی نسبت زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

جہادِ حریت

انگریز نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں اپنے مصالح و مفاد کو بھی بھول گیا۔ رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عربوں کو اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ، جمعیۃ اقوام کے بلند بانگ کاغذی اصول، انتداب کا ادعائے آزادی سب منافقت پر مبنی تھے۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انھیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی آغاز جنگ عالمگیر ثانی تک فلسطین جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا۔ اس فریب میں کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلاموں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انھیں مفت میں خرید لیا تھا۔ سابقہ دوست کا ہاتھ پرانے دوست سے حق دوستی کا تقاضا کر رہا تھا۔ اور پرانا دوست، سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔

اس جہاد حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ماڈ رائڈن نے اپنی کتاب The problem of Palestine میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے۔

د انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انہیں برباد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال و دولت کی بربادی شامل ہیں۔ ملک میں حرکت محدود (اور دشوار) ہوگئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بغیر مقدمہ چلائے محبوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر سیچل میں بغیر مقدمہ چلائے بھیج دیا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

یہ لرزہ خیز داستان ہے، ان کے لئے ناقابل برداشت جو برطانیہ، اس کے مدبرین اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں اس پر اس سے زیادہ رائے زنی نہیں کروں گی کہ آئرلینڈ کے زمانہ BLACK اور TANS کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جا رہا ہے جسے سب عیسائی یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں، ان کیلئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بیکار ثابت ہوا ہے اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے، اگر برطانوی فوج چوبیس گھنٹے چھٹی لے لے تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعاً نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کر دیا جاتے تو کل امن ہو سکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ:

ایک صاحب نے جن کا رنجیدہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنھیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے، مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے ایک "مجرم" کو دیکھا کہ وہ دو زانو ہو کر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اُسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہار

تعزیت کیا تو اس ماں نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کر دیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اللہ نے
یوں منتخب کیا ہو، قابلِ رحم نہیں، قابلِ عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ اپنی طاقت کے زعم میں اپنے جور و استبداد پر قائم رہا۔ بمبار ہوائی جہازوں کے سایہ میں ۱۹۳۸ء میں اس نے وڈ ہیڈ کمیشن Wood head Commision بدیں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے عملی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علت تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پُر ہے۔ اس نے سابقہ تجویز سے کہیں کہیں اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی۔ رپورٹ کے ایک ایک صفحہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ یہ خاموش اعتراف نمایاں ہے کہ تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی

۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعماء کو مذاکرات کے لئے لندن بلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اُٹھ چکا تھا۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کے پچیس سالوں کے انگریزی، عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بدعہدیوں اور جور و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوص نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے انھوں نے پوری جرأت سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انھوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروفِ گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانبین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۳۹ء کا مشہور قرطاسِ ابیض شائع کیا جس میں ان کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رُو سے یہودیوں کی آمد پر سے مزید پانچ سال تک کے لئے پابندی ہٹا دی گئی۔ البتہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آسکینگے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئینگے۔ پانچ سال کے بعد مزید آمد عربوں کی رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کمشنر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن سے یہودی، عربوں کی مملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں یہ خرید و فروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یعنی یہودیوں کی تعداد میں مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہوگا۔ فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاسِ ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت و

شوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم نہ کیا۔ اور اسی سال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید و فروخت اور یہودیوں کے داخلہ سے متعلق "پابندیوں" پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمہ پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاسِ ابیض کی رُو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھل سکتے تھے۔ ادھر عرب جو پہلے بکھرے بکھرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متحد و متفق ہو گئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد، حزب عمال برسرِ اقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ سے جو نئی پارلیمان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمال حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب معتمد یہودی تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر و اقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسبِ منشا کرا سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا، تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شرکائے اقتدار بنا رہے تھے۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف ممالکِ عربیہ کی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ قبل اسکے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرتا، خبر مشہور ہو گئی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے لئے جائیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک پچھتر ہزار یہودی "ناجائز" طریقے سے آ گئے تھے۔ لیکن ان کی ناجائز آمد کبھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے جنھیں صدر امریکہ خواہی نخواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والا صدارتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ تھا۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریق یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بقول شخصے، اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو ڈر تھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائینگے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار تھیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی عالمت نیز فلسطین کی صورتِ حال کی پوری

تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھجکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی، امریکی کمیشن مرتب ہوا جسے ہدایت دیگئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر اندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متفقہ سفارشات ظاہر ہے کہ نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو۔ لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ بہرحال کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من وعن تسلیم کر لیا کہ ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر کی تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی۔ بلکہ ایسی دو قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوق شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے انتداب سے نکال کر تولیت میں رکھ دینا چاہیئے۔ زمینوں کی موجودہ پابندیوں کی تنسیخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدد کو سختی سے دبایا جائے۔

ایک دفعہ پھر ثابت کر دینے کے علاوہ کہ تقسیم فلسطین نا قابلِ عمل اور ناممکن ہے، معاملہ آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

فلسطین اقوامِ متحدہ میں

انتداب عملاً برطانیہ کے لئے ایک مہنگا سودا ہو گیا تھا۔ ابتدائی عرصے میں برطانیہ کو جان اور مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ انگریز اس زیاں سے تنگ آگیا۔ کیونکہ جنگ نے برطانیہ کے لئے ایسی گوناگوں مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ فلسطین ان کی کمرِ ہمت توڑ رہا تھا۔ ناچار برطانیہ نے ۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش کر دیا۔

فلسطین اپنی مخصوص تاریخ کے اعتبار سے ایک قطعہ ارض نہیں رہا۔ جغرافیہ نے اسے کچھ ایسی اہمیت دی ہے کہ تاریخ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ سطورِ بالا سے ظاہر ہو گا کہ فلسطین کانٹوں کی سیج پر ہی رہا۔ اسی اہمیت نے اسے پھر بین الاقوامی استخوانِ نزاع بنا دیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ہر چند برطانیہ امریکہ اور روس متحد تھے، لیکن ان کے باہمی اختلافات کبھی رفع نہ ہو سکے۔ امن ہوا تو جنگ کے یہ اتحادی دو فریقوں میں بٹ گئے۔ جنگ کا جو عظیم الشان بار برطانیہ پر پڑا، اس سے وہ اپنی پہلی عظمت و استقامت بہت حد تک ضائع کر چکا ہے اور اب وہ امریکہ کا دستِ نگر ہے۔ امریکہ ایک امیر و متمول ملک ہے اور اسے جنگ نے کم سے کم نقصان پہنچایا۔ امریکہ آئندہ جنگی ممکنات کے خوف سے اس حیثیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ روس

بھی اپنے استحکام میں دیوانہ وار مصروف و منہمک ہے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کا بیشتر حصہ اس کا ہے۔ مشرقِ وسطےٰ کی اہمیت ظاہر ہے۔ جغرافیائی اہمیت پر مستزاد مشرقِ وسطےٰ کا تیل ہے۔ تیل آئندہ جنگ کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ممالک عربیہ کا تیل ایک حد تک برطانیہ اور زیادہ حد تک امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ روس کے اپنے تیل کے ذخائر کافی ہیں۔ لیکن وہ تیل کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ ایران میں اس کی دلچسپی اسی ذہنیت کی آئینہ بردار ہے۔ ترکی اور ممالکِ عربیہ میں بھی اس کی 'دلچسپی' بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی اپنی تیل کی پیداوار کافی ہے۔ لیکن اس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ذخائر کے جلدی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کا تیل مقابلتاً نو انکشاف ہے۔ وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مسابقت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہو گئے ہیں۔ مشرقِ وسطےٰ کے ممالک اپنی پسماندگی کے طفیل چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر ہیں، اس لئے یہ نعمتِ عظمےٰ ان کے لئے وبالِ جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت پھر بڑھ جاتی ہے کہ کرکوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیفہ (فلسطین) میں منتہی ہوتی ہے۔ حیفہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلط کی غماز ہیں۔

بہرکیف فلسطین کا معاملہ اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ اقوامِ متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جا کر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد دو رپورٹیں پیش کیں۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے، اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے (ایک رکن غیر جانبدار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزاء عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوامِ متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام دو صفوں میں بٹ گئیں۔ ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی وحدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنا دی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر پوری طرح غور و خوض کریں، اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی نمبر ۱ ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے، دوسری سب کمیٹی وحدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان چودھری ظفر اللہ خان کے سپرد۔

تقسیم کا فیصلہ

سب کمیٹی ۲ نے اپنی مدلل ومعقول رپورٹ میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جمعیتہ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو جمعیتہ اقوام کو بھی یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کرے، لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ مجلس عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق واختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کئے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا حق واختیار نہیں تھا۔ چہ جائیکہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرتا اور پھر اسے خواہی نخواہی مسلط کرتا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہیئے۔ برطانیہ نے اپنی روش ایسی کر لی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد ہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں، برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہوگا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ نہیں دیگا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کریگا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کرے گا اور فلسطین خالی کرے گا۔ اختتامِ انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا۔ اور امن وامان کا تنہا محافظ ہوگا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵ مئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہوگا۔ گویا وہ فلسطین کے بعض حصوں پر قبضہ کرنے کے لئے یہودیوں کا راستہ بالکل ہموار کرے گا۔

سب کمیٹی نے منشور اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جس میں مذکور ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام کو حق خود اختیاری میسر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضا مندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہل فلسطین کے سپرد ہونا چاہیئے تھا، نہ کہ اقوام متحدہ کے سپرد۔ یہودی تارکین وطن کے داخلہ فلسطین سے متعلق کمیٹی مذکورہ نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یورپی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اس لئے اس کے رقبے، ذرائع اور دیگر عناصر کے پیش نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہیئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے۔

۱؎ پولینڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی ۱ کے صدر نے سب کمیٹی ۲ کے صدر سر ظفر اللہ خان کے سامنے اعتراف کیا کہ آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفر اللہ خان اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا۔ بلکہ معلومات واندازِ استدلال کی تعریف تھی۔

(۱) جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم وستم نہیں ہو رہا۔ اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

(۲) جو بآسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جا سکتے ان کو ارکانِ اقوامِ متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی، رقبہ، ذرائع اور گنجائش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

(۳) ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے بسانے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جس میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات تبصرہ سے مستغنی اور مسئلہ زیرِ نظر کا صحیح حل تھیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوامِ متحدہ کے پیشِ نظر تو متضاد سیاسی مصالح تھے جن میں تطبیق محال تھی۔ لہٰذا حل ناممکن!

کمیٹی ۱ کے تقسیم کے حق میں سفارش کی رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے اور مختصراً چوہدری ظفر اللہ خاں کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

۲۷ نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے جسے یومِ تشکر (Thanks giving) کہا جاتا ہے اس لئے ہر رکن چاہتا تھا کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم دی جائے۔ اسی اعتبار سے جائنین نے اس دن اپنی ساری قوتیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔ اور تقسیم دفن ہو گئی ہے اس اثنا میں افواہ مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنے جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائینگے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التوا کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ گزشتہ سال یومِ تشکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقفہ میں نیویارک کے اخبارات

میں خبر آئی کہ یہودی لیڈر ٹرومین سے ملے۔ انھوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر تقسیم ناکام ہوگئی تو بجلی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفون اور تار کے ذریعہ کئی تقسیم کے خلاف مندوبین کی حکومتوں سے مصروفِ گفتگو ہوا اور انھیں اپنی ہدایات بدل دینے پر مجبور کیا اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دے دیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً (Haiti) کے نمائندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آگئی ہے۔

مسٹر روز ویلیٹ نے کہ آنجہانی صدر روز ویلیٹ کے پوتے ہیں۔ مڈل ایسٹ جرنل کی اشاعت جنوری ۱۹۴۹ء میں اقوامِ متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلے میں صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا ہے۔

ارکانِ اقوامِ متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں) ٹیلیفونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں، اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان امڈا چلا آرہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی تھیں، تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ اعادہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت ہے اس دولتِ عظمیٰ کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوامِ عالم کی قیادت کر دی ہے اور یہ ہے منظر اس ادارہ اقوامِ متحدہ کا جو اس لئے معرضِ تشکیل میں آیا کہ کرۂ ارض سے جنگ کو بدر کر دیا جائے اور اقدارِ انسانیہ کو مستقل حیثیت دے کر امن و امان کو عام اور پائندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندہ کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگائی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں سیاستِ دولِ عظمیٰ کا طغرائے امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدہ لاینحل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کر دیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے، ۱۳ مخالف، دس ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کر سکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ میں ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرتِ رائے تو ہے دو تہائی ووٹ نہیں بہرکیف یہودی ووٹوں کی خاطر تقسیم کا فیصلہ صادر کرا دیا گیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا

جائے، تقسیم کے مالہٗ وماعلیہ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تقسیم کا خاکہ اس فیصلہ کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا جس کے ارکان میں سے تین عرب، تین یہودی، اور تین اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے تھے۔ ہرچند یہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔

یہی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی، شمال میں مشرقی گیلیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں ٹل عفیف (Tel Aviv) کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف Negev پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نوہزار سات سو اسی (۵۰۹۷۸۰) عرب تھے۔ اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (۴۹۹۰۲۰) یہودی۔ گویا یہودی حصہ میں عربوں کی اکثریت تھی۔ اس غیر معقول، غیر منصفانہ تقسیم کے لئے وجہ جواز یہ پیش کی گئی، کہ یہودی بیرونی یہود کی آمد سے اپنی آبادی جلدی بڑھا لیں گے اور پھر وہ اکثریت میں ہو جائینگے۔ جافا نکال دینے کے بعد یہودی علاقہ میں چار لاکھ اٹھانوے ہزار (۴۹۸۰۰۰) یہودی اور چار لاکھ پینتیس ہزار (۴۳۵۰۰۰) عرب رہ گئے ۔ فلسطین کی کل آبادی بیس لاکھ ہے جس میں سے تیرہ لاکھ عرب ہیں اور چھ لاکھ پچاس ہزار یہودی۔ تقسیم کے حامی یہ دلیل دیتے تھے کہ یہودی آبادی کو عربوں کے ماتحت اقلیت بنے رہنے پر مجبور کرنا۔ ناانصافی اور ظلم ہے۔ لیکن یہ دلیل دینے والے عربوں کو بالکل نظر کر رہے تھے۔ اگر یہودیوں کو اقلیت بنانا ظلم تھا تو عربوں کو اقلیت بنا دینا کہاں کا انصاف تھا؟ یہودی کل آبادی کا ۳۳ فیصدی تھے۔ اسکے برعکس یہودی علاقہ میں عرب ۴۶ فیصدی تھے۔ گویا ۳۳ فیصدی کو، ۶۷ فیصدی کی حکومت کے تحت اقلیت رکھنا تو ظلم تھا لیکن ۴۶ فی صدی کو ۵۴ فیصدی کے تحت اقلیت بنا دینا ظلم نہیں تھا، عین انصاف تھا۔ مجموعی آبادی کو چھوڑ کر مختلف اجزا کی علیحدہ آبادی لی جائے تو معاملہ اور مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے۔ گیلیلی میں چھیاسی ہزار عربوں کے مقابلہ میں اٹھائیس ہزار یہودی تھے۔ نجف کی ایک لاکھ دو ہزار کی آبادی میں صرف دو ہزار (پھر سنیئے، صرف دو ہزار) یہودی تھے۔ وسطی علاقہ میں ساٹھ فیصدی یہودی اور ۴۰ فیصدی عرب۔ اگر فلسطین کے انتظامی حصوں کو علیحدہ علیحدہ لیا جائے تو یہودیوں کی حالت اور قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ فلسطین کے ۱۴ یا ۱۶ انتظامی حصوں میں سے صرف ایک یعنی حیفہ میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ باقی ہر جگہ وہ اقلیت میں تھے۔ ان کی حکومت کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ آبادی کے علاوہ زمین کی ملکیت میں بھی عرب

بڑھے ہوئے تھے۔ یہودی علاقہ میں زمین کی نجی ملکیتوں میں عربوں کا ۶۰ فی صدی حصہ تھا اور یہودیوں کا ۴ فیصدی۔ اس کے باوجود تقسیم روا رکھی گئی اور یہودیوں کو جو علاقے بخشے گئے وہ زرخیز میدان تھے جنھیں مزید ترقی دی جا سکتی تھی لیکن عربوں کے حصہ میں پہاڑی علاقے آئے جو ناقابلِ ترقی تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ عربوں کو اقتصادی بورڈ کا محتاج بنا دیا جائے اور بتدریج ان کی ترقی مسدود کر دی جائے۔

امریکہ کی مشکلات تجویز تقسیم کے بعد پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مرتب کیا گیا تاکہ وہ تقسیم کے نفاذ سے متعلق سفارشات پیش کرے۔ ڈھائی ماہ کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۴۷ء کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا کہ صورتِ حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید بگڑنے کا احتمال ہے۔ عربی قوی اندرون و بیرون فلسطین جنرل اسمبلی کے فیصلہ تقسیم کو بزورِ شمشیر بدلنے پر کمربستہ تھے اور یہودی بھی علی ہذا القیاس اپنے مطالبہ پر اڑے ہوئے تھے۔ اختتامِ انتداب پر مکمل بدامنی پھیلنے کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ مشورہ ایک لحاظ سے نیا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس پایا جاتا تھا لیکن امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرا دے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب روز بروز اپنے مطالبات میں متشدد ہوتے جا رہے تھے۔ فلسطین کی مجلسِ اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدامِ جنگ سمجھیں گے اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری عزام پاشا نے ۱۰ فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مارچ کے اوائل میں نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ قاہرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی مملکتوں کی حدود میں پائپ لائنیں بچھائیں شام کے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہوگا۔ اور حجاز بھی غالباً موجود کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ عرب گیدڑ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عزائم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزمِ غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی ووٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کر سکتا۔

فلسطین میں بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کر دی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ

نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورت حال اور نازک ہو گئی تھی۔ چیکوسلوواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشتراکی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔ خرسس روس کا سایہ فن لینڈ پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر۔ اٹلی میں انتخابات ہونیوالے تھے۔ پانچ مغربی قوتیں — برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ کے مابین پچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے امریکہ کی "مارشل امداد" کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ٹرومین ایک حد تک جبری عسکری تربیت کی اپیل کر چکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے پاس منشور کی رُو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی۔ اور اگر قومیں انفرادی طور پر فوجیں مہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آ پہنچتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی روسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان گوناگوں مصائب میں مبتلا اور متضاد صورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹ مارچ کو اچانک یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب تقسیم کا موید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر تولیت (Trustee ship) میں دے دیا جائے۔ نقاد تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو صاف نظر آ رہے تھے، امریکہ نے ان کا انکار کیا، لیکن بالآخر اسے بہت جلد ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت نے نہ محض اس کے اپنے وقار کو صدمہ پہنچایا، بلکہ اقوام متحدہ کے ادارہ کو ایک بیکار اور کھوکھلا ادارہ ثابت کر دیا۔ فلسطین اقوام متحدہ کی آزمائش تھا لیکن وہ اس میں پوری نہیں اتریں۔ اس جمعیت نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملہ پر بحث و تمحیص کی لیکن ناکام رہی۔

نئی صلیبی جنگ

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی لیت و لعل، گومگو اور تذبذب میں ۱۵ مئی کی فیصلہ کن تاریخ آ پہنچی۔ برطانیہ فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آلِ اسرائیل جو ایک دفعہ الٰہی انعام و فضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے لعنت و ذلت و مسکنت کی وادیوں میں سرگرداں چلی آ رہی تھی، اپنی ساری شیطنت کاریوں کے ساتھ قبلہ اول کی مقدس گلیوں میں تہذیب و انسانیت کو ذلیل و رسوا کرنے لگی۔ یہودی "تابوت سکینہ" کے طالوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے۔ اور وہ انہیں بطور انعام خداوندی عطا ہوا تھا۔ تاکہ انہیں "ظالمین" کے بجائے "صابرین" اور "مومنین" بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آلِ اسرائیل فطرت

کی مہلت بخشیوں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ چالیس سال صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سائے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی "مصر" میں داخل نہیں ہو سکی۔ آج وہ سود در سود، اور چور بازار کے ذریعہ کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی "تابوتِ سکینت" حاصل کرنے پر مضطرب ہیں جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانونِ مشیتِ ایزدی کے تحت ملتا ہے لیکن جو قوم فیضانِ سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اسکے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵ مئی کے بعد فلسطین میں "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا۔ اس کا مرکز تلعفیف ہے اس حکومت کی حیثیت کیا تھی۔ اور اس کی سرحدیں کونسی؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے لیکن بین الاقوامی سیاست کی طفلانہ حرکتوں نے اس حکومت کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہو رہا تھا۔ صدر ٹرومین گذشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا، لیکن روزویلٹ کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا تھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا کہ وہ نمائندہ تھا، گذشتہ سولہ سال سے برسر اقتدار چلی آرہی تھی۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ٹرومین ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار تھا جو اُسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہوتی۔ یہودی اہم مہرہ تھے۔ چنانچہ ادھر یہودیوں نے بے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کیا، ادھر صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا۔ شکاگو ٹریبون نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا۔

> ڈپلومیٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ (اسرائیلی حکومت تسلیم کرنے میں) ٹرومین نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ حکومت کیا ہے اور اس کی حدود کون سی ہیں۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا اس کی نظر یہودی ووٹوں پر تھی۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے۔

شرق اُردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ شرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ سفارش کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو بلا وجہ فوراً تسلیم کر لیا ہے۔ امریکہ کے اقدامات میں شریک ہونے کے لئے روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ نہیں کیا تھا۔ روس پھر اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

جن حالات میں "اسرائیل" کا قیام عمل میں لایا گیا، ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت روز روشن کی

طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ نتیجہ ہے منظم بین الاقوامی سازش کا، یہ دراصل میوۂ تلخ ہے اس تخمِ خبیث کا جسے عیسائیت اپنی روح کی گہرائیوں میں بوتی چلی آئی۔ صلیبی جنگوں میں اسی کی فصل پک کے تیار ہوئی تھی۔ اور جلالِ اسلام کی درانتی سے خوب خوب کٹی تھی۔ یورپ کی تہذیبِ جدید نے اس فصل کی ازسرِ نو آبیاری کی۔ انگریز اس ذہنیت کا زندہ مجسمہ تھا۔ چنانچہ اس کی پوری استعماری تاریخ اس نکتہ کی تفسیر ہے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کو اس نے حرفِ غلط کی طرح مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ سلب و نہب سے بے دست و پا بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس نے برہمن سے ملی بھگت کی اور اس مہرے سے انہیں شہ مات دینے میں مصروف و منہمک رہا۔ جب اسے آخرکار برصغیر کو یوں آزاد کرنا پڑا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہوگیا، تو اس نے افراتفری مچادی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان پہلے دن سے ہی یوں ہندو کے رحم و کرم پر ہو جائے کہ اس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہو۔ اس پر بھی وہ اقوامِ عالم کی صف میں بیٹھ کر پوری ڈھٹائی سے کہتا چلا آرہا ہے کہ اس نے خوشدلی سے برصغیر کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔

اس "خوش دلی" کا مظاہرہ فلسطین میں بھی ہوا۔ یہودی ترکِ وطن کے برساتی نالوں کا رخ موڑ موڑ کر اس نے یہودی آبادی کو عربوں کے برابر کردیا اور اسے ایک حکومت کی طرح مسلح ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ یہودی قزاق ہر طرح تیار ہیں تو از خود اپنے انخلاء کی ایک تاریخ مقرر کرکے فلسطین چھوڑ کے چلا گیا۔ اس نے اختیارات منتقل کرنے کی معروف صورت اختیار نہیں کی۔ اسے چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت مقامی نمائندوں کو سونپ دیتا اور اگر کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا تو اقوامِ متحدہ سے درخواست کرتا کہ وہ کوئی مناسب متبادل انتظام کردے، یعنی خود اس انتظام کو سنبھال لے۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور عربوں اور یہودیوں کی جنگ کے باوجود فلسطین کو چھوڑ دیا۔ اسرائیل کو معرضِ وجود میں لانے کی یہی واحد اور یقینی صورت تھی۔ یہودیوں اور عربوں کو لڑتا چھوڑ کر آجانے کے بعد اس نے اقوامِ متحدہ سے درخواست کی کہ وہ معاملہ کو ہاتھ میں لے۔ اقوامِ متحدہ میں سازش کا رشتہ امریکہ نے سنبھال لیا اور اس نے اسرائیل کی غاصب حکومت پر عالمی مہرِ تصدیق ثبت کرادی اور اس کا راستہ بھی ہموار کردیا کہ اقوامِ متحدہ نے اپنی تجویز تقسیم میں جتنے علاقے یہودیوں کے لئے تجویز کئے تھے وہ ان سے کہیں زیادہ ہتھیا کر بیٹھ جائیں۔ فلسطین کا مسئلہ انیس سال سے اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش ہے لیکن وہ اس رکن ملک کو اس حد تک مجبور کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ انہی علاقوں پر قناعت کرنے پر راضی ہوجائے جو اقوامِ متحدہ نے اپنے طور پر انہیں دینا چاہے تھے۔ اس کی وجہ سے گو عربوں کا موقف اقوامِ متحدہ کے باہر یہی ہے کہ غاصب حکومت اسرائیل کو ختم ہونا چاہیئے، لیکن اقوامِ متحدہ کے اندر وہ یہی مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کرنے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لئے اقوامِ متحدہ

نے متعین کی تھیں۔

انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فلسطین چھوڑ دیا تو فلسطین میں باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ یہ جنگ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بھی تھی اور عربوں اور عربوں کے درمیان بھی۔ عربوں کے باہمی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑتے لڑتے بھی آپس میں لڑنے سے باز نہ آتے اور لڑتے بھی وہ فلسطین ہی کے محاذ پر۔ بلکہ ان کی نگاہ یہودی دشمن پر کم اور عرب ہمسائے پر زیادہ تھی۔ یعنی ان کی کوشش زیادہ تر یہ نہیں تھی۔ کہ یہودیوں کا راستہ روکا جائے، بلکہ یہ کہ ان کا دوسرا عرب بھائی فلسطین کا کوئی حصہ یہودیوں سے چھین کر اپنے تصرف میں نہ لے لے۔ انہیں ڈر یہ تھا کہ جس کسی نے بھی فلسطین کا کچھ حصہ آزاد کرا لیا وہ اسی کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اور پھر اس کی سلطنت کی حدود اسی تناسب سے وسیع ہو جائیں گی۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے، کہ کوئی عرب ملک ان کے مقابلے میں اس طرح پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو جائے۔ اس قسم کا تصادم اغراض مصر اور اُردن (جو اُن دنوں شرق اُردن کہلاتا تھا) کے درمیان خصوصیت سے زیادہ تھا۔ اتفاق سے عربوں میں (شرق) اُردن ہی ایک ایسا ملک تھا جس کے پاس منظم اور جنگجو فوج تھی۔ چنانچہ گو مصر نے فلسطین کے جنوبی صحرا کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا، اُردن نے دریائے اُردن کے مغرب کا اچھا خاصہ علاقہ آزاد کرا لیا اور مسلمانوں کے متعدد مقاماتِ مقدسہ، حتیٰ کہ یروشلم کے پرانے حصے کو بھی یہودیوں کی دستبرد سے بچا لیا، اس بنا پر وہ شرق اُردن سے اُردن بن گیا لیکن اس طرح ایک ایسی استخوانِ نزاع پیدا ہو گئی کہ عرب آج تک فلسطین کے بارے میں کوئی مشترک لائحہ عمل نہیں بنا سکے۔ اس کا افسوسناک مظاہرہ ابھی حال ہی میں ہوا جب کہ اسرائیل نے اردن کے خلاف جارحیت کا ثبوت دیا۔ اُن دنوں قاہرہ سے باقاعدہ پروپیگنڈا ہوتا تھا، کہ اُردن کی حکومت کو دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ گویا فوری مسئلہ اسرائیل کی جارحیت نہیں تھا شاہ حسین کی معزولی تھا۔

اُردن کا ردِ عمل اسرائیل کے خلاف بالعموم قابلِ تعریف رہا۔ شاہ حسین اس ناخواندہ اور غاصب مملکت کے اس حد تک خلاف ہیں کہ انھوں نے ایک شاہی مجلس اس مقصد کے لئے قائم کر رکھی ہے کہ اُردن پر جارحانہ حملہ ہوا تو وہ خود لڑنے کے لئے محاذ پر پہنچیں گے اور اگر وہ کام آ گئے تو یہ مجلس کاروبارِ حکومت سنبھال لے گی۔ انھوں نے ان فلسطینیوں کو بھی حقوقِ شہریت دے دیئے جو اُن کے ملک میں آ گئے ہیں۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور اُلجھا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ اُلجھا دیا گیا ہے۔ یہودیوں نے جن علاقوں پر تسلط جمایا ہے ان میں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے۔ ان مظلومین کو عربوں نے اپنے ہاں ابھی تک آباد نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آباد ہو کر عرب ممالک میں جذب ہو گئے تو فلسطین کو

بھول جائینگے۔ اور اس طرح تحریک استخلاص فلسطین کو نقصان پہنچے گا۔ اس موقف کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اگر فلسطینیوں کو متعلقہ ممالک میں آباد ہونے دیا گیا تو دریائے اُردن کے مغرب میں جو فلسطینی اردن کے حصے میں آئے ہیں، انہیں اور ان کے علاقے کو اُردن کا حصہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے بچنے کے لئے فلسطینی مظلومین کو اپنا شہری تسلیم نہیں کیا گیا۔ چنانچہ صورت یہ ہے کہ اس وقت کم و بیش تیرہ لاکھ مہاجرین ان کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں جو قائم تو مختلف عرب ممالک میں ہیں لیکن ان کا انتظام اقوام متحدہ کے ایک ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ادارہ باہر مجبوری یہ انتظام سنبھالے ہوئے ہے اور مہاجرین بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہیں زندگی کی آسائشوں سے وہ بالعموم محروم ہیں اور نہ گھر کے ہیں نہ گھاٹ کے۔ عرب ممالک بہرحال اقوام متحدہ پر کڑی نکتہ چینی تو کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان بے گھر فلسطینیوں کے لئے مناسب انتظام نہیں کرتی لیکن وہ خود انہیں اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، نہ اُن کے مصائب کے ازالے کے لئے کوئی اقدامات ہی کرتے ہیں۔ اہل فلسطین ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اب تک ایک نئی نسل کیمپوں میں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہے۔ اس پوری نسل کا کیا ہوگا؟ اور بات ایک نسل کی نہیں، دوسری نسل ان کے پہلو بہ پہلو تیار ہو رہی ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟ کون ذمہ دار ہے اس کا؟ یہ نسلیں کس گناہ کی پاداش میں "قتل" ہو رہی ہیں؟ ہر گذرنے والا سال عربوں سے یہ سوال پوچھتا ہے ـــــ اور ان کا دامن جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن عرب ایک دوسرے کا دامن کھینچ کھینچ کر انہیں تار تار کرنے سے ہنوز فارغ نہیں ہو سکے اور نہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں تشتت و افتراق کی رَو کو روک سکیں گے۔

فلسطین کے مسئلہ پر عرب سربراہ بھی کئی بار مل بیٹھے ہیں اور عرب لیگ کے نمائندوں نے بھی بارہا سر جوڑے ہیں۔ انھوں نے مشترکہ دفاع تک کا منصوبہ تیار کیا ہے لیکن کوئی عملی کام نہیں ہو سکا کیونکہ یہی طے نہیں ہو پاتا کہ فلسطین کو آزاد کیسے کرایا جائے۔ اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا کہ عرب ممالک مشترکہ جدوجہد کریں۔ حالانکہ مل جل کر ہی یہودیوں کے خلاف مؤثر محاذ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجویز بار بار پیش کی جاتی ہے کہ فلسطینیوں کو منظم کر کے انہیں یہودیوں کے خلاف لڑنے دیا جائے اور پھر ان کی امداد کی جائے۔ گویا جس طرح الجزائری مجاہد فرانس کے خلاف لڑے، اسی طرح فلسطینی یہودیوں کے خلاف لڑیں۔ یہ درست، لیکن اس تجویز کا محرک جذبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطین کا جو حصہ اُردن کے پاس ہے وہ اردن سے "آزاد" ہو جائے گا اور اُردن شرق اُردن بن کے رہ جائے گا۔ اسی جذبہ کے تحت حال ہی میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مصر کی فوجیں بھی اُردن میں متعین کی جائیں تاکہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑ سکیں۔ اس کا جواب، بجا طور پر، اُردن نے یہ دیا کہ اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اوّل تو ہر ملک کی فوجیں ان سرحدوں پر موجود ہونی چاہئیں جو اسرائیل سے ملتی ہیں، دوسرے مصر کو اسرائیل ہی کے مقابلے

کا خیال ہے تو وہ اپنی فوجیں یمن سے کیوں واپس بلا نہیں لیتا۔ واضح رہے کہ مصر کی چالیس ہزار سے زاید فوج کئی سالوں سے یمن میں مقیم ہے اور معزول امام یمن اور شاہ سعود کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ فوج اسرائیل کیخلاف کام میں لائی جا سکتی ہے اور لائی جانی چاہیئے لیکن عربوں کی باہمی رقابتوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی قوت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہی ضائع ہو رہی ہے۔

اسرائیل کی زبانی مخالفت اور باہمی خانہ جنگی کا سنگین نتیجہ ۱۹۵۶ء میں نکلا جب اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ مصر ان میں سے کسی ایک طاقت کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن روس کی مداخلت اور روس اور امریکہ کی مسابقت کے طفیل اس کھلی جارحیت کو روک دیا گیا۔ اور اقوام متحدہ نے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر بین الاقوامی فوج متعین کر دی۔ اس جارحیت کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ مصر نے نہر سویز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس آبی شاہراہ پر بین الاقوامی تسلط ختم ہو گیا۔ اس طرح ان سازشوں کا سلسلہ ختم ہو گیا جو اس تسلط کے طفیل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ پہلو بڑا خوش آئند ہے لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں ہے۔ نہر سویز پر قبضہ کر لینے سے اسرائیل کی ناکہ بندی نسبتاً اور مضبوط ہو گئی لیکن محض اس طرح کی ناکہ بندی فیصلہ کن ثابت نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ عملی سبق بالکل نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی ملک کی ناکہ بندی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تھا۔ تو اس وقت اقوام عالم نے اس کی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ کی ناکہ بندی کب سے ہو رہی ہے۔ روہوڈیشیا کی ناکہ بندی کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ناکہ بندی کے یہ فیصلے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھے کیونکہ بہت سی قومیں ان کی مؤید تھیں۔ اگر وہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکے تو عربوں کی طرف سے اسرائیل کی محدود ناکہ بندی نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناکہ بندی نہ کی جائے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تنہا ناکہ بندی کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ امریکہ اس ناکہ بندی میں نہ محض شریک نہیں، وہ اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ عرب ایک راستہ بند کرتے ہیں تو امریکہ کے ہاتھوں کئی در کھل جاتے ہیں اور یہ در مسلسل کھل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ عرب بھی جانتے ہیں اور دنیا ساری بھی جانتی ہے۔

اسرائیل بہت بڑا خطرہ ہے۔ مزید خطرہ یہ ہے کہ اس کی سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی سارے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ اب صرف مقبوضہ فلسطین میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے کیونکہ یہودی مسلسل اسرائیل میں درآمد کئے جا رہے ہیں۔ اسرائیل کے جارحانہ عزائم اپنی جگہ، محض بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر ایک نہ ایک دن اسرائیل کو مزید علاقے کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لئے توسیع ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ گویا یہودی "مجبور" ہوتے جا رہے ہیں

کہ وہ مزید عربی علاقے ہتھیائیں۔ یہ علاقے انہیں عربوں سے فتح کرنے ہونگے۔ وہ اس کے لئے تنبا نہ روز کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خطرناک جنگی تیاریاں بھی کر رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے جگہ پیدا کرنے کے لئے صحراؤں کو آبادکاری کے قابل بھی بنا رہے ہیں۔ جہاں تک جنگی تیاریوں کا تعلق ہے، اسرائیل، امریکہ کی شہ پر اور مدد سے، ایٹمی طاقت بننے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اس چور دروازے سے بھارت کو بھی مددی جا رہی ہے۔ عرب اسے جانتے ہوئے بھی بھارت کو دوست سمجھے جا رہے ہیں۔

جہاں تک یہودی آبادکاری کا تعلق ہے، اس سے عربوں کے لئے بالعموم اور اُردن کے لئے بالخصوص ایک نیا فتنہ پیدا ہو گیا ہے۔ اسرائیل یہ منصوبہ روبہ عمل لا رہا ہے کہ جھیل گلیلی کا پانی نکال کے اپنے صحراؤں کو مزید یہودیوں کے لئے قابل رہائش بنائے۔ اس منصوبے کا مطلب یہ ہے کہ دریائے اردن، جس پر اُردن کی معیشت کا دارومدار ہے، خشک ہو جائے اور یہ ملک صحرا بن جائے۔ اُردن کے کہنے پر عربوں نے اس کا جواب یہ سوچا ہے کہ جو دریا جھیل گلیلی میں آکے گرتے ہیں، ان کا رُخ اوپر سے ہی موڑ دیا جائے۔ اسرائیلی منصوبے کا یہ ایک حد تک جواب تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عرب ایسا کر گزریں گے؟ اسرائیل نے تو فیصلہ ہی نہیں کیا، وہ تو عمل بھی کر رہا ہے۔ عرب باتیں ہی کئے جا رہے ہیں۔ وہ اگر باتیں ہی کرتے تو توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر عمل کا مرحلہ بھی آجائے گا۔ لیکن وہ باتیں کرتے کرتے آپس میں اُلجھ جاتے ہیں۔ اور اسرائیل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ اُس مسلسل جارحیت کا جواب نہیں جو برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے اسرائیل کی شکل میں عربوں کے خلاف روا رکھی گئی اور جو کسی وقت بھی عربوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے لیکن عرب شاید یہ تو سمجھ گئے ہیں کہ ع

"تیری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
لیکن یہ راز جانے وہ کب پائیں سے
سنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی تربیت و لذتِ نمود میں ہے!
فلسطین کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے سوا کچھ نہیں۔

جشنِ نزولِ قرآن مجید

بزمِ طلوعِ اسلام کی طرف سے ہر سال رمضان المبارک کے اختتام پر جشنِ نزولِ قرآن مجید (جسے عرفِ عام میں عید کہا جاتا ہے) مخصوص انداز میں منایا جاتا ہے۔ امسال یہ جشن ۱۴؍ جنوری (ہفتہ) کی شب اور ۱۵؍ جنوری اتوار کی صبح کو منایا گیا۔ ہفتہ کی شب کا جشنِ مسرت، ذوقِ سماعت و لذتِ کام و دہن کے لئے مخصوص تھا۔ قرآنی منزل، ۲۵؍ بی گلبرگ کے صحن میں، شامیانوں سے ترتیب دادہ، نہایت حسین و جمیل ہال جس کی تزئین و آرائش، سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کے جذبۂ تحسین کی آئینہ دار تھی۔ نشست گاہ تھی جس میں اربابِ ذوق و شوق پر مشتمل نہایت شستہ و شائستہ محفل سرِشام آراستہ ہوگئی۔ تقریب کا پہلا حصہ پنجابی شعراء کے حسنِ کلام کے لئے مخصوص تھا جنہوں نے دنیائے تصورات کی رعنائیوں سے فضا کو کیف و سرور سے معمور کر دیا۔ درمیان میں حسین و سادہ دعوتِ طعام تھی۔ اور اس کے بعد کلامِ اقبال، محترم نذیر فاروقی صاحب کے نغماتِ سحر آفریں کے پیکروں میں، وجہ شادابی قلب و دماغ ۔۔۔ یہ محفل نصف شب تک جاری رہی۔ اتوار کی صبح، پرویز صاحب کے درسِ خصوصی کے لئے مختص تھی جس کا عنوان تھا۔

"قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟"

خطاب کیا تھا' رموز و حقائق، فکر و نظر اور علم و بصیرت کا سحر آفریں مرقع تھا جس نے سامعین پر وجد کی کیفیت طاری کر رکھی تھی ۔۔۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو نمناک نہ ہو، کوئی قلب نہ تھا جو وقفِ اضطراب نہ ہو۔ جذبِ انہماک کا یہ عالم تھا کہ وقت کا احساس ذہنوں سے محو ہو چکا تھا۔ چنانچہ اڑھائی گھنٹے پلک جھپکنے میں گذر گئے اور جب خطاب ختم ہوا، تو کسی کا اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ہم بزمِ طلوعِ اسلام (لاہور) کے نمائندہ اور اراکین کی خدمت میں ان کی اس مستحقِ صد حمد و ستائش کامیابی پر دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ میں پرویز صاحب کا خصوصی خطاب

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

شائع ہو رہا ہے۔ قارئین انتظار فرمائیں۔ ایجنسیاں اس شمارہ کی زائد کاپیوں کی تعداد سے قبل از وقت اطلاع دیں۔

ناظم ۔۔۔ ادارہ طلوعِ اسلام

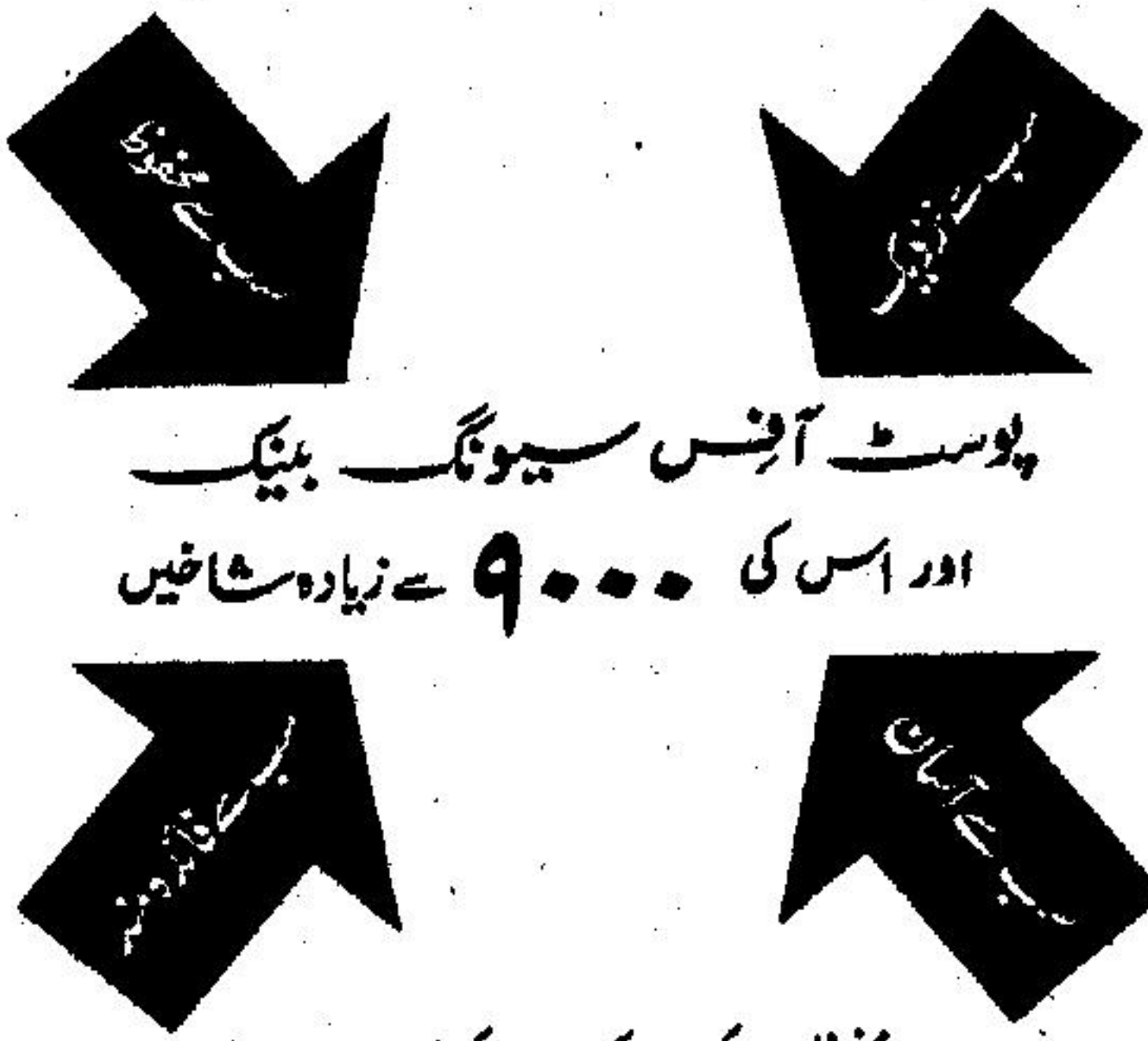

سب سے محفوظ

سب سے نزدیک

پوسٹ آفس سیونگ بینک

اور اس کی ۹۰۰۰ سے زیادہ شاخیں

سب سے فائدہ مند

سب سے آسان

سب سے محفوظ: حکومت پاکستان اس کی ضامن ہے۔

سب سے آسان: آپ صرف دو روپے سے حساب کھول سکتے ہیں۔ اس کے بعد ایک روپیہ کی رقم تک جمع کروا سکتے ہیں یا نکلوا سکتے ہیں۔ ایک بڑے ڈاک خانہ کی حدود میں ہر چھوٹے ڈاک خانہ سے رقم نکلوانے کی سہولت بھی مہیا ہے۔

سب سے فائدہ مند: عام حسابات پر چار فیصد اور ایک، دو یا تین سال کیلئے جمع کی ہوئی رقم (فکسڈ ڈپازٹ) پر ساڑھے چار، پانچ اور ساڑھے پانچ فیصد تک سالانہ منافع ملتا ہے۔ منافع پر انکم ٹیکس معاف۔

سب سے نزدیک: آپکے گھر یا دفتر کے آس پاس کوئی نہ کوئی ڈاک خانہ ضرور ہوگا۔

پوسٹ آفس

سیونگ بینک

بچت کیجیے

اپنے وطن کے لئے

بابُ المراسلات

سائنس اور خُدا

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آجکل پاکستانی اخبارات میں ایک تحریک چلائی جارہی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ سائنس کو مسلمان کیا جائے اس کا طریقہ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ مثلاً یہ کہنے کے بجائے کہ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کے ملنے سے پانی کا ایک قطرہ بن جاتا ہے۔ یہ کہا جائے کہ

جب دو حصے ہائیڈروجن کے ساتھ ایک حصہ آکسیجن مل جائے تو خدا اس سے ایک قطرہ پانی پیدا کر دیتا ہے۔

اس طرح سائنس مسلمان ہو جائے گی۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

طلوعِ اسلام

جب کسی کشتی کا لنگر نہ ہے تو پانی کی لہریں اور ہوا کے جھونکے اُسے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لئے پھرتے ہیں اور اس کے کہیں پاؤں ہی نہیں ٹکتے۔ یہی حالت ہم پاکستانیوں کی ہو رہی ہے۔ اس مملکت کی کشتی کا لنگر قرآنِ کریم کو بننا تھا۔ اس کا یہ لنگر بن نہیں سکا اور اب یہ موجوں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ڈانواں ڈول پھر رہی ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اس کی اسی بے بسی کی آئینہ دار ہیں۔

قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات کا نظم و نسق خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین کے مطابق چل رہا ہے سائنس، ان قوانین کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ اور اس کا طریق تجرباتی ہے۔ تجرباتی طریق کے معنے یہ ہیں کہ وہ ایک مفروضہ کو بطورِ نظریہ اپنے سامنے رکھ کر اس پر عمل شروع کرتی ہے۔ کچھ عرصہ کی تگ و تاز کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ پھر دوسرا نظریہ لے کر اس کے پیچھے چلنے لگ جاتی ہے۔ اس طرح بار بار کی کوشش (TRIAL AND ERROR) کے

ذریعے، کسی ایک قانون کو دریافت کر لیتی ہے۔ وہ اس طرح فطرت سے متعلق بعض قوانینِ خداوندی کو حتمی طور پر دریافت کر چکی ہے اور باقیوں کے دریافت کرنے کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ قوانین کس قدر ہیں اور سائنس کو ان تک پہنچنے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔ جو قانونِ خداوندی اس طرح سے دریافت ہو چکا ہو اس کے متعلق ایسا کہنے میں کہ "خدا یوں کرتا ہے" کچھ ہرج نہیں۔ لیکن جو انکشافات ہنوز تجرباتی عمل کے مرحلہ میں ہیں، ان کے متعلق ایسا کہنا بڑا خطرناک ہے۔ مثلاً ہمارے متقدمین نے (یونانی تصوّر کے مطابق) یہ سمجھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے انہوں نے اپنے اس تصوّر کو ان الفاظ میں پیش کیا کہ خدا نے زمین کو ساکن پیدا کیا ہے اور سورج کو ایسا کہ وہ اس کے گرد گردش کرے۔ بعد کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ یہ غلط ہے، زمین گردش کرتی ہے۔ اب صورت یوں ہو گئی کہ

(۱) دسویں صدی میں خدا نے زمین کو ساکن پیدا کیا تھا ——— اور

(۲) بیسویں صدی میں خدا نے زمین کو متحرک پیدا کر دیا۔

اب خود سوچئے کہ یہ بات کیا بنی ——— ہمیں کہنا یہ چاہیئے کہ اس وقت تک سائنس کے انکشافات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ .....

اور اگر کسی معاملہ میں قرآن کریم نے کسی قانونِ فطرت کو خود بیان کر دیا ہے تو جب سائنس کا انکشاف اُس نتیجہ پر پہنچے تو ہمیں کہہ دینا چاہیئے کہ اس نے حقیقت (TRUTH) کو پالیا ہے۔

لہٰذا "سائنس کو مسلمان" بنانے کا یہ طریقہ نہیں۔ اسے مسلمان کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیں کہ :-

(۱) نظامِ فطرت خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین کے مطابق کارفرما ہے۔

(۲) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کو دریافت کیا جائے۔

(۳) جب ہم اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں، تو انہیں، نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے، ان مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنا چاہیئے جنہیں خدا نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ اس سے سائنس مسلمان ہو جائے گی۔

لیکن اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ دینے سے کہ "یہ سب کچھ خدا کرتا ہے"، ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے اور ہماری سائنس بھی مسلمان، تو یہ وہ خود فریبی ہے جس کی نقاب کشائی قرآن نے بہت پہلے کر دی تھی۔ اس میں کئی ایک مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ :

اگر ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں سے مسخر ہیں، تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کرتا ہے۔ اگر ان سے پوچھو کہ بادلوں سے مینہ کون برساتا ہے اور اس طرح زمین مردہ کو زندگی کون عطا کرتا ہے تو یہ جواب میں کہیں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ (۲۹/۶۱ ۔ ۶۳)

وہ اس قسم کے شواہد پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ لوگ اسے تو تسلیم کرتے ہیں کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کار فرما ہیں، لیکن جب خود اپنی زندگی کی طرف آتے ہیں تو اس میں اپنے لئے آپ قوانین وضع کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ۔ (۲۹/۶۱) یہاں پہنچکر تم اُلٹے کہاں پھر جاتے ہو؟ اپنی زندگی کو خدا کے قوانین کے تابع کیوں نہیں رکھتے؟ ۔۔۔ دوسری جگہ ہے۔ قُلْ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ ۔ (۲۳/۸۹) ۔۔۔ ان سے پوچھو کہ اس مقام پر تمہیں کیا دھوکا لگ جاتا ہے؟ یاد رکھو محض اتنا کہہ دینے سے کہ خارجی کائنات میں خدا کی کار فرمائی ہے، تم خدا پرست نہیں بن سکتے۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس حقیقت کو عملاً تسلیم کیا جائے کہ ۔۔۔ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (۴۳/۸۴) ۔۔۔ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کی حکمرانی ہے، اسی طرح انسان کی ارضی زندگی میں بھی اسی کے قوانین کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔

اصل یہ ہے کہ پاکستانی مسلمان کی زندگی بڑی قابلِ رحم ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا کہ ؎

ہے دلِ پُر حسرتِ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے!

یہ حالت پاکستانی مسلمان کی ہو رہی ہے۔ اس نے پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا لیکن اس میں اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے سے اس کی جان جاتی ہے ۔۔۔ اس سے مذہبی طبقہ سے ان کی پیشوائیت چھنتی ہے اور "دنیا دار" طبقہ سے ان کے ذاتی مفاد۔ لہٰذا یہ دونوں ہی نہیں چاہتے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی ہو ۔۔۔ اب یہ سانپ کے منہ میں چھپکلی والا معاملہ ہے کہ نہ نگلی جائے نہ اُگلی بنے۔ یہاں کا مسلمان نہ اسلام سے انکار کر سکتا ہے نہ اس کے قوانین کی حکمرانی اپنے اوپر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اس قسم کے سوانگ بھرتا رہتا ہے جس سے معلوم ہو کہ یہاں اسلام کا بڑا چرچا ہے، لیکن درحقیقت یہاں اسلامی قوانین بار نہ پانے پائیں ۔۔۔ ریل کے ڈرائیور سے کہو کہ وہ انجن میں قرآن شریف کا نسخہ رکھے، بس کے ڈرائیور بسم اللہ پڑھ کر بس چلائیں۔ ہوائی جہاز میں یہ اعلان کرتے وقت کہ جہاز فلاں وقت فلاں جگہ پہنچے گا، انشاء اللہ کہا جائے (تاکہ جہاز کا عملہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو

جائے) اوقاف کے روپے سے خانقاہوں کی مرمت کرائی جائے، عرس دھوم دھام سے ہوں، پیروں فقیروں کے کشف و کرامات کے قصے شائع کئے جائیں، دارالعلوموں کو وظائف دیئے جائیں۔ ان کے فارغ التحصیل طلباء کو یونیورسٹی کے گریجوایٹوں کے برابر تسلیم کیا جائے۔ رمضان شریف میں شراب بند کر دی جائے اور اس کے احترام میں ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جائیں، شب برات پر چلنے کا کوٹہ ڈیوڑھا کر دیا جائے، غلاف کعبہ کے جلوس نکالے جائیں، قرأت کی مجلسیں آراستہ کی جائیں، قرآن شریف کو لاکھوں روپے کے صرف سے قیمتی ریشم کے کپڑے پر سونے کے تاروں سے لکھا جائے۔ یا ہر وزیر اپنے عہدہ کا حلف اٹھانے کے بعد سیدھا کسی مزار پر سجدہ ریزی کے لئے حاضر ہو اور اپنی ہر تقریر کی تان اس پر توڑے کہ تمہیں اپنے آپ کو قرآن کے پیکر میں ڈھالنا چاہیئے ـــــ یہ سب وہ اسلامی جھنجھنے ہیں جن سے قوم کے بچوں کو بہلایا جاتا ہے کہ وہ اماں کو ستائیں نہیں۔ انہی میں اب اس کا اضافہ ہو رہا ہے کہ سائنس پڑھاتے وقت یوں کہو کہ خدا یوں کرتا ہے ـــ اگر یہ کر دیا گیا تو سائنس اسی طرح مسلمان ہو جائے گی جس طرح جب جماعت اسلامی نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو کہدیا تھا کہ قرارداد مقاصد پاس کرنے سے مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ ؎

خدا ایں سخت جاں را یار بادہ
کہ افتاد است از بامِ بلندے

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

کراچی:۔ سندھ اسمبلی ہال نزد سعید منزل۔ بندر روڈ ہر اتوار کی صبح ۔ ۹½ بجے

لاہور:۔ ۲۵/بی گلبرگ۔ ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے

ملتان:۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ ہر جمعہ۔ بعد نماز مغرب۔

لائلپور:۔ پنجاب ڈیری۔ ۲۰۔ بی۔ اے۔ پیپلز کالونی ہر جمعہ۔ بعد نماز مغرب

سرگودھا:۔ ۱۵۔ نیو سول لائن۔ کوارٹر ۲۔ ہر اتوار ۵ بجے شام

انگلستان:۔ بزم طلوع اسلام ۔ ۱۷۰ سالٹ سٹریٹ بریڈ فورڈ۔ ۸ کے زیر اہتمام یہ درس ہر اتوار کی صبح دس بجے نشر ہوتا ہے۔ بریڈ فورڈ سے باہر رہنے والے احباب نمائندہ بزم کو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر ٹیپ بھی منگوا سکتے ہیں۔

راولپنڈی:۔ ہالکو تر بلڈنگ۔ متصل زنانہ کالج۔ مری روڈ۔ ہر جمعہ شام ۵ بجے

لیہ:۔ متصل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ۔

نقد و نظر

۱۔ مَنْحَمَنّا

دنیا کے زبان دانوں کے عجیب و غریب قصّے ہم نے سنے تھے۔ لیکن جس انداز کا زبان دان، عبدالعزیز خالد کے پیکر میں ہمارے سامنے آیا ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں مل سکے۔ انگریزی میں تو خیر کہا جاتا ہے کہ وہ ایم۔ اے ہیں اور ایم۔ اے اکثر ہوتے ہیں لیکن انہیں عبرانی اور ارامی پر بھی اس قدر عبور نظر آتا ہے کہ بایدوشاید۔ فارسی کا ہم نے اس لئے نام نہیں لیا کہ ان کی اردو بھی ــــ شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ــــ جیسی غالبی اردو ہے۔ ہندی زیرِ نظر کتاب میں پہلی دفعہ سامنے آئی ہے۔ ہندی ہم نے اس لئے کہہ دیا کہ ہم سنسکرت نہیں جانتے ورنہ ہو سکتا ہے کہ یہ ہندی نہیں سنسکرت ہی ہو۔ باقی رہی عربی، تو وہ تو ان کے دل و دماغ میں اس طرح رچی اور سموئی ہوئی ہے جس طرح رگِ حیات میں خونِ زندگی ــ الفاظ کی آمد و کثرت کا یہ عالم ہے کہ ایک بحرِ مواج ہے جو اپنی تلاطم خیزیوں کے ساتھ امنڈے چلا آ رہا ہو۔ پھر ان زبانوں کا علم ایک ترجمان (INTERPRETER) کا سا علم نہیں کہ اُسے متعلقہ زبانوں کے صرف الفاظ و معانی یاد ہوتے ہیں۔ ہمارے اس جواں سال و جواں بخت شاعر کے تبحرِ علمی کا یہ عالم ہے کہ ان تمام زبانوں اور ان کے علاوہ یونانی اور لاطینی تک کے ادب اور ان کی حامل اقوام کی تاریخ، کلچر، افسانے، معتقدات، اصنامیات پر بھی اس کی غائر نگاہ ہے۔ اور ان تمام ذہنی صلاحیتوں پر طرّہ یہ کہ اس کا دل مسلمان ہے جس سے خدا پر ایمان، اس کے رسولؐ سے محبت اور اس کی کتاب سے شیفتگی چھلک چھلک کر باہر آ رہی ہے۔ یہی پیمانے سے چھلک کر باہر آ جانے والی متاعِ محبت ہے جسے انہوں نے زیرِ نظر کتاب ــ مَنْحَمَنّا ــ میں سمٹا لیا ہے۔ منحمنا کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ ــــ یہ منجملہ اسمائے رسولِ مقبول ــــ کتاب کا آغاز ان حسین و جمیل جواہر پاروں سے ہوتا ہے کہ ــ

مطاعِ آدم و انجم، متاعِ لوح و قلم
محمد اُمّی محبوبِ کبریا، صلعم

محمدؐ انجمن کن فکاں کا صدر نشیں | محمدؐ افسرِ آفاق و سرورِ عالم
وہ عبدہٗ و رسولہٗ، وہ اسمہٗ احمد | کتاب و حکم و نبوت کا خاتم و خاتم
حمود و حامد و احمد محمد و محمود | کریم و میر کرام و مکرم و اکرم

ہے جس کا وصف و بیاں کان خلقہ القرآن
جو ہر جہت سے ہے فخم و مفخم و افخم

اور پھر اسی روانی کے ساتھ اسی قافیہ میں قریب ساڑھے چار سو مرصع اشعار زیب دہ اوراق ہیں۔ ان میں قرآن و حدیث و تاریخ کی تلمیحات قدم قدم پر سامنے آتی ہیں، اور جب اس سے بھی شاعر کا جی نہیں بھرتا تو قرآن کی پوری کی پوری آیات اس انداز سے مصرعوں میں سمو دی جاتی ہیں۔ — مخاطب تکشفنا عنطاءلک عنلک — ادھر عربی کا یہ عالم ہے۔ اُدھر ہندی کی یہ کیفیت کہ۔

یہ سرب بھومی کا راجہ، مہابلی، سمراٹ!
اپار، اتھاہ، اننت، ایک، اینک، بشوا تم

کہیں ابراز سے گزر کر اس قسم کے لطیف اشارات سے کام لیا گیا ہے۔

مماثلت ہے بس اتنی بہ ابتلا و بلا
جو ہے میانہٗ اہرام و کلمۂ ابرم

ان کے پیام کا انداز اس قسم کا ہے۔

دیارِ جبر میں ابنِ جبیر بن کے رہو
بہ مد علم و تمدن بنو ابن الہیثم
علی الطویٰ اصبروا ہے نشانِ حزب اللہ
شریکِ زمرۂ ابلیس ہر غلام شکم

اس قسم کی صلاحیتوں کے پیکر کے متعلق جب یہ سنا جاتا ہے کہ وہ دن بھر دفتر کی چکی بھی پیستا[1] ہے تو کس کا جگر خون ہو کر نہیں رہ جائے گا۔ دیکھئے اس باب میں خود اس کا اپنا احساس کس قدر شدید ہے۔ جو وہ کہتا ہے کہ ؎

کہاں مسائلِ دفتر کہاں مذاقِ سخن | ہے تیرے فضل سے یہ امتزاجِ شعر و خدم

---

[1] خالد صاحب محکمہ انکم ٹیکس میں ایک اعلیٰ افسر ہیں۔

میں کر رہا ہوں اسے نوش جبرًا و قہرًا
نہیں ہے مجھ سے نہاں، زہر ہے مشوب و سم

اس استعداد کا مالک اگر کسی زندہ قوم میں ہوتا تو اسے ہم کسی یونیورسٹی کی مسند پر متمکن دیکھتے جہاں وہ اپنے علم وفن کی گہرائیوں سے نژادِ نو کی کشتِ فکر و نظر کو سیراب کرتا اور یوں یہ متاعِ ملت اپنے صحیح نتائج مرتب کرتی ــــ لیکن بہ حالاتِ موجودہ، تو ہمیں اس میں بھی شک ہے کہ ان کے کلام کو ہماری نئی نسل سمجھ بھی سکے گی؟ (ضمناً انہیں چاہیئے تھا کہ جس طرح انہوں نے اپنی کتاب فارقلیط کے ساتھ الواح دی تھیں جن میں ان تلمیحات کی تشریح اور کتب متعلقہ کے اقتباسات درج کر دیئے تھے، اس کتاب کے آخر میں بھی اسی قسم کی الواح دیتے۔ اس کے بغیر تو ان الفاظ کے معانی بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکیں گے۔)

کتاب اعلیٰ درجہ کے سفید، دبیز کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ جلد مضبوط اور ڈسٹ کور ازرنگ۔ اور قیمت صرف (۲/۵۰) ــــ کتاب بک لینڈ، ۱۲ محمد بلڈنگ ۔ بندر روڈ۔ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ ہم اس مرقع حسنِ معنوی و صوری پر محترم خالد صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

۲۔ فارقلیط

یہ بھی خالد صاحب ہی کی کتاب ہے جو ستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ موضوعِ سخن کتاب کے نام سے ظاہر ہے ــــ نامِ ختم رسل انجیل میں ہے فارقلیط ــــ اور اندازِ سخن یگانہ:

کریم السجیہ، جمیل الطویہ
نو خیر البریہ، شر انبیاء ہے

ان دونوں کتابوں میں فاصلہ تو صرف دو ہی سال کا ہے لیکن ان کے تقابل سے نظر آجاتا ہے کہ خالد کی فکر کس برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ کتاب (۱۲۸۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی اہم خصوصیت وہ الواح ہیں جو کتاب کے آخر میں قریب ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ خالد، عام شاعروں کی طرح، محض سنی سنائی باتیں نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے حوالے ہی نہیں اقتباسات تک پیش کرتا ہے۔ ان الواح سے یہ کتاب ایک طرح دائرۃ المعارف سی بن گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم نے کتاب اول پر تبصرہ کے سلسلہ میں لکھا ہے) خالد کا صحیح مقام ایک معلم کا ہے۔ اور اس کی کتابیں نصاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کتاب خطِ نستعلیق میں طبع ہوئی ہے اور نہایت پاکیزہ ــــ قیمت دس روپے جو اس قسم کی کتاب کی، زیادہ نہیں)۔ اسے ایوان پبلشرز۔ بہ فیض محمد فتح علی روڈ پاکستان چوک کراچی نے شائع کیا ہے۔

۳۔ قصیدۃ الصداقۃ العظمیٰ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس ڈاک سے ہمیں فارقلیط کا نسخہ برائے تبصرہ موصول ہوا اسی سے' علامہ تمنا عمادی (مدظلہ) کا زیر نظر کتابچہ بھی موصول ہوا۔ خالد صاحب نے فارقلیط میں' اسلامی تاریخ کے واقعات کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس رنگ میں وہ ہمارے ہاں مروج چلے آتے ہیں! اور جن سے بعض بزرگانِ عظام کی ذات مطعون ہوتی ہے۔ علامہ تمنا کا روایات' تاریخ اور سیر کی تحقیق و تنقید میں جو مسلک ہے قارئین طلوع اسلام اس سے واقف ہیں (ہمارے نزدیک' اس زمانہ میں' اس فن کا ان سے زیادہ ماہر کوئی نہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور ان کی ہمت میں برکت عطا فرمائے)۔ انہوں نے فارقلیط کے اسی قسم کے مقامات کا تعاقب کیا ہے اور اسی بحر' وزن اور قافیہ میں' اس پر منظوم تنقید کی ہے۔

ہمارے قرنِ اول کی تاریخ کے سلسلہ میں ہمارا مسلک بھی قارئین سے مخفی نہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن رفقائے محمدؐ کو مومن حقا کہہ کر ان کے ایمان کی شہادت دی ہے' اگر تاریخ میں کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے جس سے ان کے ایمان و عمل پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ واقعہ وضعی ہے اور بلا تامل مسترد کر دینے کے قابل۔ علامہ تمنا کا بھی یہی مسلک ہے۔ اس لئے ہم ان کی اس تنقید سے تو متفق ہیں لیکن اس باب میں ایک اصولی نکتہ کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں۔

خالد صاحب ایک شاعر ہیں' تاریخ کے محقق نہیں۔ انہیں جو کچھ ہماری تاریخ میں ملا' انھوں نے اس کو زبانِ شعر میں پیش کر دیا۔ (بلکہ شاعری کو تو مبالغہ کا لائسنس بھی حاصل ہوتا ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے بلند پایہ شعراء بھی محفوظ نہیں رہتے۔ خالد صاحب کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں)۔ لہٰذا' یہ تنقید خالد صاحب پر نہیں خود ہماری تاریخ پر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہماری تاریخ کو از سرِ نو مرتب نہیں کیا جاتا ہم عجم کی اس سازش کے تباہ کن اثرات سے بچ نہیں سکتے' جو ہماری وضع کردہ تاریخ کے راستے ہمارے لئے موجب ہلاکت بنتی چلی آ رہی ہے اور بن رہی ہے (اس کی تازہ ترین مثال' ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی رسوائے عالم کتاب' خلافت و ملوکیت ہے جس میں انہوں نے' دیگر صحابہؓ تو ایک طرف خلیفہ ثالث' حضرت عثمانؓ کی ذاتِ گرامی کو بھی نہیں بخشا۔ جب ان سے اس گستاخی پر مواخذہ کیا گیا تو انھوں نے نہایت بیباکی سے کہہ دیا کہ یہ سب کچھ میں نے مستند تواریخ سے لیا ہے' اور اتنا نہ سوچا کہ جن بزرگانِ عظام کی انھوں نے اپنی کتاب میں تعریف کی ہے' انہی مستند کتب تاریخ "میں خود ان کے خلاف بھی اتنا ہی کچھ موجود ہے)

بہرحال' ہم کہہ یہ رہے تھے کہ درحقیقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو از سرِ نو مرتب کیا جائے۔

اور یہ کام علامہ تمنا یا محمود احمد عباسی صاحب (جنہوں نے اس کتابچہ کو شائع کیا ہے) جیسے اہلِ نظر حضرات کرسکتے ہیں جو فرقہ بندی سے بھی بلند ہیں اور جن کی تاریخ کے نشیب و فراز پر بھی گہری نگاہ ہے۔

یہ کتابچہ مکتبہ محمودیہ۔ ۲/۳ - بی ایریا۔ لیاقت آباد کراچی ۱۹ سے مل سکتا ہے قیمت اس پر درج نہیں۔

۴۔ تفاسیرِ ابومسلم اصفہانی

ہمارے متقدمین میں معتزلہ اہلِ علم کا وہ گروہ تھا جن کی نگاہ صحیح اسلام پر تھی۔ اور وہ قرآن کریم پر عقل و بصیرت کی رو سے غور و فکر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو ہماری مذہبی پیشوائیت کس طرح جینے دیتی۔ نتیجہ یہ کہ نہ صرف ان اربابِ فکر و نظر ہی کا خاتمہ کر دیا گیا، بلکہ ان کے علمی کارناموں کو بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ ابومسلم اصفہانی کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کی کوئی مبسوط تفسیر لکھی تھی جو آج معدوم ہے۔ امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں یہ انداز رکھا ہے کہ وہ مختلف آیات کی تفسیر میں متقدمین کی آراء پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی روش کے اتباع میں انھوں نے کہیں کہیں ابومسلم اصفہانی کی تفسیر کے بعض فقرے بھی درج کر دیئے ہیں۔ پروفیسر رفیع اللہ اور سید نصیر شاہ صاحب نے تفسیر کبیر کی ضخیم مجلدات سے ان جواہر پاروں کو ایک ایک کرکے چُنا۔ پھر ان کا ترجمہ کیا۔ اور ایک مفید مقدمہ اور تعارف کے ساتھ زیرِ نظر کتاب میں پیش کر دیا ہے۔ جسے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا تھا۔ ان حضرات نے اس سے ایک اچھی خدمت سرانجام دی ہے جس کے لئے ہم انہیں مستحق تبریک سمجھتے ہیں۔

قرآنی حقائق کو ہر دور کے انسان، اپنے اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے کسی دور کے نتائج فہم کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا، یہ ضروری نہیں کہ ہم اصفہانی کے فہم قرآنی سے حرفاً حرفاً متفق ہوں۔ زمانہ، علمی اعتبار سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اس لئے آج کے دور کا انسان حقائق قرآنی کے سمجھنے کے لئے متقدمین سے بہتر پوزیشن میں ہے۔ بایں ہمہ جس کسی نے بھی قرآن کریم کو علم و بصیرت کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ ہمارے نزدیک اصولی طور پر مستحقِ ستائش ہے — اور اسی اعتبار سے ہم اصفہانی کی فکر اور ان مترجمین کی کوشش کو درخورِ تشکر قرار دیتے ہیں۔ کتاب متوسط سائز کے قریب دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ نیوز پرنٹ پر چھپی اور پکس بورڈ کور کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ قیمت فی نسخہ ۳/۵۰ روپے ہے۔

۵۔ اداب اُردو

حکیم گلچیں کرنالی صاحب نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ اردو لکھنے (اور بولنے) میں، قواعد اور تلفظ کے اعتبار سے عام طور پر کس قسم کی غلطیاں کی جاتی ہیں۔ اور ان کی صحیح شکل کیا ہے۔ غلط اور صحیح کے معیار کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

> ہم زبان کے وسیع مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اُردو کے معاملہ میں سب سے بڑی سند اور صحیح رائے ان بزرگوں کی ہے (جن کے سرخیل سید انشاء اور خوشہ چینی ہم ہیں)۔ سرسید احمد خان، خواجہ حالی، مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد مولانا سلیم، ڈاکٹر کیفی، سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبدالحق (جو اہل زبان بھی ہیں) جن لفظوں کو یہ صحیح قرار دیتے اور استعمال کرتے ہوں، ان کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔ اور جن اہلِ زبان کی رائے، ان کی رائے کے خلاف ہو اس کو مسترد کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد انہوں نے اس قسم کے نکتہ چینیوں کی تحریروں کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ یہ لوگ خود کس کس قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔

چونکہ ہم اس مسئلہ میں حکم بننے کی پوزیشن میں نہیں، اس لئے ہم اس نزاعی مسئلہ کو انہی حضرات پر چھوڑتے ہیں ـــــ زبان کے معاملہ میں ہمارا مسلک تو یہ ہے کہ

غوّاص کو مطلب ہے گہر سے، نہ صدف سے

کتاب، چھوٹے سائز کے قریب دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ نیوز پرنٹ پر چھپی ہے۔ اور دو روپیہ پچاس پیسے میں، مصنف سے، اردو مشن، ملتان کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

۶۔ میزان الحق، ۷۔ حقیقت معراج

یہ دونوں کتابیں حکیم سید عبدالقیوم صاحب کی تصنیف ہیں اور مکتبہ قیومیہ، منڈی بہاؤالدین، کی طرف سے نیوز پرنٹ پر شائع ہوئی ہیں۔ اول الذکر کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ہے۔ اور ثانی الذکر کی ایک روپیہ ـــ میزان الحق میں، شفاعت، وسیلہ، اور غیر اللہ کو پکارنے کے سلسلہ میں، مسلمانوں میں جو عام (اور خلافِ اسلام) عقاید، متواتر چلے آرہے ہیں، ان کی تردید، اور قرآنِ کریم کی روشنی میں ان کی صحیح

پوزیشن واضح کی گئی ہے۔ اور دوسری کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ معراجِ نبوی کے سلسلہ میں جو حکایات تاریخی کتب روایات میں مذکور ہیں، ان سے حقیقت کس طرح زیرِ نقاب آگئی ہے۔ حکیم صاحب کا تعلق فرقہ (اہلِ قرآن) سے ہے اور اسی نہج سے وہ ان مسائل کی تحقیق و تہذیب کرتے ہیں۔

عوام میں پھیلے (یا بالفاظِ صحیح پھیلائے) ہوئے اس قسم کے غلط عقاید کا ازالہ اور ان کی جگہ قرآن کی صحیح تعلیم کی تبلیغ، ایک مفید کوشش ہے۔ لیکن (جیسا ہم نے ایک دفعہ پہلے بھی گزارش کیا تھا،) ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اپنی گروہ بندانہ سطح سے بلند ہو کر امت کے اجتماعی امور سے متعلق قرآنی راہ نمائی کو پیش کریں، تو اس سے فی الواقعہ قرآن (اور مسلمانوں) کی صحیح خدمت ہوگی۔ اس وقت وہ فرقہ واری کی تنگنائے میں محبوس ہو کر، اپنے آپ ہی کو نہیں، خود قرآن کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں اور — يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔

طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام یہاں سے بھی مل سکتے ہیں

لاہور

(۱) انٹرنیشنل بک سروس .. ۵، دی مال
(۲) کلاسیک بک سیلرز - ۴۲ دی مال
(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس - ۳۴ دی مال
(۴) کواپریٹو بک شاپ .. .. ۴۰ دی مال
(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۴۵ دی مال
(۶) بک سنٹر .. .. چوک ریگل دی مال
(۷) ادبستان .. .. .. چوک لکشمی
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس .. ۱۹۲ - انارکلی
(۹) مکتبہ پاکستان .. - چوک انارکلی
(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی
(۱۱) مرکز ادب .. .. چوک انارکلی
(۱۲) نیشنل بک سٹال .. چوک انارکلی
(۱۳) ماڈل بک سٹال .. ٹولنٹن مارکیٹ دی مال

لائلپور

(۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم۔ اے کلی ۷ بلاک ۱ نزد پرانی غلہ منڈی۔ ریل بازار
(۲) شریف سنز۔ بک سیلرز۔ کارخانہ بازار۔ لائلپور
(۳) حافظ محمد یونس صاحب ۱۱۰ بلاک ۱۶۔ جگلرگ۔ لائلپور۔

لیہ

— متصل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن ہر جمعہ کو بعد نمازِ عصر۔

انگلستان

— محترم رشید احمد بٹ صاحب۔ ۱۴۰ سالٹ سٹریٹ۔ بریڈ فورڈ ۸

کراچی

— (۱) محترم محمد اسلام صاحب (۴-۱۰۰) رئیس روڈ نیو ٹاؤن کراچی ۵۔ فون نمبر ۲۲۵۸۰۰
(۲) ہر اتوار کی صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے سندھ اسمبلی ہال نزد سعید منزل بندر روڈ
(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر
(۴) عوامی کتب خانہ۔ بولٹن مارکیٹ
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز۔ بندر روڈ۔ کراچی۔
(۶) جنرل بک ڈپو۔ فریئر روڈ۔ نزد حبیب بنک۔ کراچی۔
(۷) اقبال کتاب گھر۔ سمرسٹ اسٹریٹ۔ صدر کراچی۔

سرگودھا

— حکیم حسن محمد نظامی۔ نظامی دواخانہ۔ بلاک ۲۔ گلی مچھلی والی۔ سرگودھا

میانوالی

— صوفی عبدالرحمٰن صاحب۔ جلد ساز چوک فتح خان۔ ملک مظفر سٹریٹ۔ میانوالی

ملتان

— دانشکدہ۔ حسین آگاہی۔

حقائق و عبر

کرسمس اور ریڈیو

۲۵ دسمبر کو کرسمس کی تقریب پر ریڈیو اسٹیشن لاہور سے ایک خاص پروگرام نشر ہوا۔ لیکن یہ عیسائی حضرات تک محدود تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کا حضرت عیسٰےؑ سے کوئی تعلق نہیں جو انھیں اس قسم کی تقریب میں شامل نہیں کیا جاتا؟ ان سے مسلمانوں کے تعلق کی تو یہ کیفیت ہے کہ جب تک ایک شخص حضرت عیسٰےؑ (اور دیگر انبیاء کرامؑ) کی نبوت پر ایمان نہ لائے، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور ایمان بھی اس قسم کا کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ — ان میں منصبِ نبوت کے اعتبار سے کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے۔ لہٰذا، اگر ان حضرات انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں ریڈیو سے کوئی خاص پروگرام نشر ہو تو اُسے اُنہیں کے پیروؤں تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس میں مسلمانوں کو بھی شریک کرنا چاہیئے۔ جو قرآنی نقطۂ نگاہ سے ان کے کوائفِ حیات اور تعلیم کو سامنے لاکر بتائیں کہ وہ اپنے وقت میں اسی طرح خدا کے رسول تھے جس طرح محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ لیکن ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ اگر کوئی فلم ایسی آجاتی ہے جس میں ان انبیاء کرام کی تمثیل کو خود ان کے پیرو سامنے لاتے ہیں، تو ہم شور مچا دیتے ہیں کہ اسے بند کیا جائے۔ کیونکہ یہ انبیاء کرامؑ ہمارے بھی نبی ہیں۔ لیکن جب انہی انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں کوئی تقریب منائی جاتی ہے تو ہم یوں لحاف میں منہ دے کر سو رہتے ہیں جیسے ہمارا ان حضرات سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

دین و دانش را غلام ارزاں دہد

ڈاکٹر ذاکر حسین خان ایک پرانے کانگریسی ہیں۔ انہوں نے تحریکِ ترکِ موالات کے زمانہ میں، علی گڑھ یونیورسٹی سے مفاظہ کیا۔ مولانا محمد علی جوہر (مرحوم) نے ایک آزاد درس گاہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ)

کی بنیاد رکھی تو ڈاکٹر صاحب اس میں شامل ہوتے اور بعد میں اس کے شیخ الجامعہ بھی قرار پائے۔ انھوں نے اس ادارہ کو کانگریسی خیالات کا مرکز بنایا۔ تقسیم ہند کے بعد وہیں رہے اور اب بھارت کی مملکت کے نائب صدر ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ انہیں بھارت میں ایک بڑا مقام حاصل ہے لیکن درحقیقت انہیں وہاں رہنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے جسے (کسی مسلمان نے نہیں بلکہ) بھارت ہی کے ایک ہندو نے لکھا ہے۔ مسٹر نیرد۔ سی۔ چودھری بین الاقوامی شہرت کے اہلِ قلم ہیں ہندوستان کے ہفتہ وار اخبار (Now) کی ۹ دسمبر کی اشاعت میں ان کا ایک نہایت پُرمغز اور بیباک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے ہندو سیکولرازم کے نقاب کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے پہلے یہ لکھا ہے کہ اس سیکولر اسٹیٹ کی سب سے بڑی نمائندہ مسز اندرا گاندھی رام لیلا کے خالص مذہبی تیوہار میں شرکت کرتی ہیں اور وہاں وہ تمام رسومات ادا کرتی ہیں جو ہندو دھرم کا جزو ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ۔

> مسز اندرا گاندھی کی شرکت سے بھی کہیں زیادہ تعجب انگیز واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں بھارت کے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب رام لیلا گراؤنڈ (دہلی) میں تشریف لائے۔ اور انہوں نے اس تقریب کا افتتاح کیا۔ میں نے یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا جس سے میں محوِ حیرت رہ گیا۔ اس لئے کہ ہم ہندو، رام کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی زبان پر مرتے وقت بھی رام کا نام تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کو اس کا علم ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی جاننا چاہیئے تھا کہ رام لیلا کے تیوہار میں شرکت سے وہ شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں جو اسلام کی رُو سے گناہِ عظیم ہے۔ اور احادیثِ نبوی نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ اس سے ایک مسلمان اس توحید کے بلند و بالا مقام سے گر جاتا ہے جو نہایت پاکیزہ تصور ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں تو انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اگر وہ اسلام کے پیرو نہیں رہے اور اپنے آپ کو سیکولر قرار دیتے ہیں تو اس سے وہ شرک کے الزام سے تو بچ جائیں گے لیکن پھر ہندوؤں کے اس دعویٰ کی حقیقت کیا رہے گی کہ دیکھو! ہم نے ایک مسلمان کو اپنی مملکت کا نائب صدر بنایا ہے اور یہ چیز ہماری اسٹیٹ کے سیکولر ہونے کی بین دلیل ہے۔ یہ چت بھی میری اور پٹ بھی میری، کی پالیسی کم از کم ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی۔

میں ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے کہوں گا کہ بھارت کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان پر معاشرتی، سیاسی یا اخلاقی نقطۂ نگاہ سے یہ کسی طرح بھی لازم نہیں آتا تھا کہ وہ رام لیلا کے خالصتہً ہندوانہ تیوہار میں اس طرح شریک ہوں۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں قریب پندرہ یا سولہ برس کا تھا جب میں نے بت پرستی کے عقیدہ کو خیرباد کہا۔ اس کے بعد آج تک میں نے کسی مندر میں جھانک کر نہیں دیکھا۔

(بحوالہ پاکستان ٹائمز)

یہ ہے ہندوستان میں رہنے والے، سب سے بلند منصب پر فائز مسلمان کی حالت جس پر کفر بھی طعنہ زن ہے۔ کتنی بڑی ہے ہماری خوش بختی جو ہمیں پاکستان کا خطۂ زمین حاصل ہو گیا جس میں ہم اس قسم کی ذلتوں سے محفوظ ہو گئے۔

ہندو کے عزائم

راشٹریہ سیوک سنگھ، ہندوستان میں، ہندوؤں کی ایک بڑی مؤثر جماعت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں کانگرس ہو یا راشٹریہ سیوک سنگھ (جو ہندو مہاسبھا کا دوسرا نام ہے) ان سب کا مشترکہ پروگرام (خاکم بدہن) پاکستان کو ختم کرنا ہے۔ کانگریس، اس مقصد کو بیرونی طاقتوں (امریکہ یا روس وغیرہ) کی مدد سے حاصل کرنا چاہتی ہے اور مہاسبھائی اسے اندرونی دباؤ سے اکھنڈ بھارت میں تبدیل کرنے کے مشئوم عزائم رکھتے ہیں۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے دستور کی ایک شق یہ ہے کہ

ہندوستان ایک ہندو قوم ہے اور گائے ہماری عظمت کا مقدس نشان ہے۔

اس جماعت کے سربراہ نے "ہماری قومیت" کی تعریف" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں لکھا تھا کہ:

ہندوستان میں قوم سے مطلب صرف ہندو قوم ہے۔ غیر ہندو اس قومیت میں شامل نہیں ہو سکتے۔ قومیت پانچ اجزاء سے مرکب ہوتی ہے۔ یہ پانچوں اجزاء جغرافیائی، نسلی مذہبی اور لسانی ہیں۔ اس ملک میں ۱۔ ہندوستانی، ۲۔ ہندو قوم۔ ۳۔ ہندو مذہب ۴۔ ہندو کلچر اور ۵۔ ہندو زبان قومی نظریہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ ساری باتیں ہندوستان میں موجود ہیں۔ اور ان کو موجود رہنا چاہیئے۔ وہ تمام لوگ جو ہندو قوم، ہندو مذہب، ہندو کلچر، اور ہندو زبان سے تعلق نہیں رکھتے، وہ قومی زندگی سے قدرتی طور پر

باہر ہیں۔

اب اس جماعت کا تقاضا ہے کہ

غیر ہندو لباس، رسم و رواج، شادی بیاہ، کفن دفن کے طور طریق، یہاں تک کہ مکانات کی تعمیر میں بھی ہندوؤں کے طریقے اختیار کریں۔ (بحوالہ "مدینہ" بجنور۔ یکم جنوری ۱۹۶۷ء)

یہ ہیں ہندو کے عزائم! اب آپ نے سمجھا کہ پاکستان نے آپ کو کیا عطا کیا ہے؟

گائے کس چیز کی علامت ہے

"ہندو مذہب کیا ہے؟ اور ہندو کسے کہتے ہیں؟" اس سوال کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کے بڑے بڑے وِدوان اور سکالر اس مقام پر پہنچ کر تھک کر قلم رکھ دیتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اختلاف ایک چیز ہے جو ہندوؤں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہے گائے کی تقدیس۔ اسے ہندو مٹنے نہیں دینا چاہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ گائے کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ یہ درحقیقت برہمنی سیاست کی صحیح علامت (SYMBOL) ہے۔ برہمن نے انسانوں کو چار ورنوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ برہمن کھشتری، ویش اور شودر۔ اور ان کے ذمے مختلف کام لگا رکھے ہیں۔ گائے کی علامت اس برہمنی ٹیکنیک کی صحیح آئینہ دار ہے۔ کھشتری گائے کے سینگ پکڑتا ہے۔ ویش اسے چارہ ڈالتا ہے۔ شودر اس کا گوبر اٹھاتا ہے اور برہمن اس کا دودھ دوہتا ہے۔ یہ ہے ساری برہمنی سیاست جو صدیوں سے مذہب بن کر مسلط ہے اور جس کی علامت گائے ہے۔ برہمن اسے کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی سیاست کی یہ مقدس علامت مٹ جائے۔

سونے کا اکتناز

قرآن کریم کی رُو سے دولت کو روک رکھنا سنگین ترین جرم ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (۹/۳۴)

جو لوگ چاندی سونے کو جمع کر رکھتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں چھوڑتے (اے رسولؐ) تو انہیں الم انگیز تباہی سے آگاہ کر دے۔

یہاں مراد تو دولت جمع کرنے سے ہے لیکن قرآنِ کریم نے اس کے لئے الفاظ "چاندی اور سونا" استعمال کئے ہیں۔ ان الفاظ کی اہمیت حال ہی میں سامنے آئی جب امریکہ کے نیشنل سٹی بینک کی طرف سے یہ خبر شائع ہوئی، کہ

گزشتہ سال دنیا بھر میں سونے کی تمام پیداوار نجی ہاتھوں میں چلی گئی۔ بینکوں کو نئے سکوں کے اجراء کے لئے سونا نہ مل سکا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں سکے جاری کرنے والا نئے سکے جاری کرنے سے قبل ایک خاص تناسب میں سونے کے ذخائر اپنے پاس رکھتا ہے۔ گذشتہ برس ڈیڑھ ارب مالیت کا سونا نکالا گیا۔ اس میں سے ایک تہائی سونا صنعتوں اور فنونِ لطیفہ میں استعمال ہوا اور باقی دو تہائی لوگوں نے بچا کر رکھ لیا کیونکہ انہیں یہ خدشہ ہے کہ سکے کی مالیت کم ہوتی جا رہی ہے اور سونے کے نرخ بڑھنے کا امکان ہے۔ حکومت اور سنٹرل بنک سونا نہ خرید سکے کیونکہ مارکیٹ میں سونا باقی نہ بچا۔ سال گذشتہ کے پہلے نو ماہ میں سونے کے سرکاری ذخائر میں ۵ کروڑ ڈالر مالیت کے سونے کی کمی رہ گئی۔ (بحوالہ "مشرق" ۱۶ جنوری)

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے سونے چاندی کی انفرادی ملکیت کے تصور کے خلاف جو تہدید ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی تھی، وہ دنیا کے آج کے کرنسی کے نظام پر بھی کس قدر اثر انداز ہے! جس جہنم میں دنیا جل رہی ہے اس کی آگ اس نظامِ سرمایہ داری کی بھڑکائی ہوئی ہے جس کے خلاف قرآن نے اتنا عرصہ پہلے اس شدت سے احتجاج کیا تھا۔

ہدیۂ تشکر

جشنِ عید کی تقریب پر میرے قرآنی احباب مجھے مبارک باد کے خطوط بھیجا کرتے ہیں جو ان کے خلوص و محبت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ میں ان احباب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا کرتا ہوں۔ امسال، یہ خطوط اتنی کثرت سے موصول ہوئے ہیں — اور دوسری طرف میری مصروفیت اس قدر زیادہ ہو گئی ہے — کہ ان تمام احباب کی خدمت میں فرداً فرداً ہدیہ سپاس گزاری پیش کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ لہٰذا، میں 'طلوعِ اسلام' کی وساطت سے ان تمام دوستوں کا اجتماعی طور پر شکریہ ادا کرتا ہوا دعا گو ہوں کہ اس قسم کی سینکڑوں عیدیں ان کے نصیب ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ امید ہے احباب میری اس اجتماعی شکر گزاری کو شرف پذیرائی عطا فرمائیں گے۔ والسلام۔

رہینِ خلوص و کرم
پرویز

فکرِ پرویز

> محترم حسن عباس رضوی صاحب کی تقریر جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۸۶ء سے خطاب کیا۔
> عدم گنجائش اسے اس سے پہلے شائع کرنے میں مانع رہی جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

برادرانِ عزیز!

اس محفلِ قرآنی میں آج میں اُس مردِ قلندر کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے میخانۂ حجاز کی ٹوٹی پھوٹی صراحیوں کی ٹھیکریاں جمع کر کے ان پر لکھی ہوئی داستانِ پارینہ کو از سرِ نو مرتب کیا — اور دنیائے انسانیت کو وہ فکرِ روشن عطا کی جس سے بیگانہ ہو کر وہ جہالت کی تاریکی میں دم توڑ رہی تھی۔ ہاں وہ مردِ قلندر جس نے کاروانِ حیات کو منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لئے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کر دی جس نے فلسفۂ زندگی کا ایک مکمل مفہوم دے دیا۔ جس نے کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کے اسرار بے نقاب کر دیئے اور مافیہا کا سینہ چاک کر کے رموزِ فطرت آشنا حقائق میں رکھ کر انسانیت کے سامنے بے مزد و معاوضہ رکھ دیئے۔ انسان نے جو اپنے آپ کو مجبور و مقہور تصور کرتا تھا اس قلندر کی دی ہوئی روشنی کی بدولت اپنی خودی کو فلک الافلاک کی بلندیوں پر جلوہ بار دیکھ لیا۔ اور یہ خاک نشیں آسمانوں پر کمندیں پھینکنے لگا۔ اور جب اس کے سامنے اسرار و رموزِ کائنات بے نقاب ہوئے تو وہ بے ساختہ پکار اٹھا ؎

مردِ راہداں

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمتِ مردانہ!!

یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن نے زندگی کا منتہائے مقصود قرار دیا ہے۔

اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی (۵۳/۴۲)

اور یہی وہ مقام ہے جہاں ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
جاتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

یہ سب کچھ جس مردِ قلندر کی عرق ریزی اور شبانہ روز محنت سے ہمیں مفت ہاتھ آیا۔ اُس کو ہم اور آپ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں پرویز کہتے ہیں۔ اُس مردِ راماں نے ہم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ ہمیں کبھی کسی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ اگر کچھ کہا تو صرف اتنا کہا ؎

سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا!

قرآن اور معاشیات

فکرِ پرویز کے متنوع گوشے ہیں اور ان میں سے ہر گوشہ مختلف کیفیات کا حامل ہے۔ اس لئے اگر اس فکر کو جامع طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت لاحق ہوگی اور یہ اس وقت ناممکن ہے اس لئے میں اس کے صرف ایک گوشے سے متعلق گفتگو کروں گا۔ یہ وہ گوشہ ہے جسے ہماری طبیعی زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی معاشی مسئلہ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پرویز صاحب نے قرآن حکیم کا جو مفہوم یا تفسیر پیش کی ہے اس کی بنیاد معاشیات پر رکھی گئی ہے۔ اور جس معاملہ پر بھی بحث کی گئی ہے اُس میں معاشی پہلو غالب ہے۔ اگرچہ یہ اعتراض لاعلمی یا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ فکرِ پرویز زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ زندگی کا معاشی پہلو ایسی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے واقعی اسی شد و مد سے پیش کیا جانا چاہیئے تھا۔ جہاں تک میرے حقیر مطالعہ کا تعلق ہے، کوئی بھی نظامِ حیات بغیر معاشیات کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس سے معاشیات کو الگ کر دیا جائے تو وہ نظام زرگاہِ ابلیس بن کر رہ جاتا ہے۔

برادرانِ عزیز! اسلام بھی ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیاد اور اساس اُن قوانین و ہدایات پر ہے جو قرآنِ حکیم میں عطا کئے گئے ہیں۔ قرآن اِن قوانین و ہدایات کے اتباع کا لازمی صلہ اس دنیا میں رزق یعنی سامانِ زیست کی فراوانی قرار دیتا ہے اور ان قوانین سے روگردانی کا نتیجہ سامانِ زیست سے محرومی

بتاتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کی رُو سے جو قوم رزق کی دولت سے مالامال ہے اُس پر خدا کا انعام ہے۔ اور جو بھوک اور افلاس میں مبتلا ہے اُس پر خدا کا عذاب ہے۔ اس حقیقت کو ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا ۔ اللہ تعالیٰ ایک مثال کے ذریعے اس طرح سمجھاتا ہے۔

قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً

ایک بستی تھی جو نہایت امن اور سلامتی کی حالت میں تھی۔

يَاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ

اُس کے لئے سامانِ زیست (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔

فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ۔

پھر جب اُس کے رہنے والوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکر گزاری کی تو اس جرم کی پاداش میں ـــــ

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۲)

اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ اور یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

دیکھا آپ نے اللہ تعالیٰ کس طرح معاشی استحکام کی فراوانی کو اپنا انعام اور بھوک اور افلاس یعنی معاشی ناہمواری کو اپنے عذاب سے تعبیر کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کا معاشی پہلو ایک ایسی پرکھ ہے جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قانونِ خداوندی کا صحیح معنوں میں اتباع ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس حقیقت کو قرآن اس طرح بیان کرتا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ (۲۰/۱۲۴)

جو ہمارے قانون سے اعراض برتتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور اُسے قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائیگا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا۔ (۱۷/۷۲)

جو اس دنیا میں اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہو گا بلکہ اس سے بھی گیا گزرا۔

قانونِ الٰہی کے نفاذ کا مقصد

آگے بڑھنے سے پہلے میں قرآن حکیم کے دو اور مقامات آپ کے سامنے لاتا ہوں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نظامِ حیات

کے معاشی پہلو کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ نہ صرف اہمیت دیتا ہے بلکہ اس کو اس دنیاوی زندگی میں اپنے نظام کا نقطۂ ماسکہ قرار دیتا ہے۔

قرآنی احکامات کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کا اتباع کرنے سے انسان کا انفرادی اخلاق سنورتا ہے اور یہی انسان کی ارتقاء کا آخری مقام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان احکامات کی اطاعت سے انسان کا انفرادی اخلاق سنورتا ہے لیکن سنورے ہوئے اخلاق مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک اور بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں اس طرح واضح کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۱۸۳)

اے وہ لوگو! جن کا اس حقیقت پر یقین ہے کہ اخلاق صرف قانونِ خداوندی کی پیروی کرنے ہی سے سنورتا ہے، تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح اقوامِ سابقہ پر، تاکہ تمہارا کریکٹر بلند ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کریکٹر بلند ہو بھی گیا تو پھر کیا ہوگا۔ لیکن بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ کریکٹر اسلئے بلند کرنا مقصود ہے کہ ایک فعال جماعت معرضِ وجود میں آئے۔ کہ ——

لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ

—— باطل نظام مٹ جائے اور اس دنیا میں خدا کا اقتدار و اختیار قائم ہو جائے۔ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ محض اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے ایسی جماعت کی تشکیل چاہتا ہے بات یہ نہیں۔ اس کا اقتدار و اختیار تو پہلے ہی تمام کائنات پر قائم ہے۔ وہ یہ سب کچھ چاہتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کی بھلائی کی خاطر۔ وہ انسانی دنیا میں ایسے نظام کی تشکیل چاہتا ہے جس کا ضابطۂ قوانین قرآنِ حکیم ہو۔ متذکرہ بالا آیت کا آخری ٹکڑا اللہ تعالیٰ کے اس اقتدار اور اختیار کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ -

تاکہ تم اپنی محنت کے بھرپور نتائج دیکھ سکو۔

صلوٰۃِ موسیٰؑ

یہی وہ نظام تھا جس کے قیام کے لئے حضرت موسیٰؑ کو چنا گیا۔ سب سے پہلی وحی میں ہی خدا نے حضرت موسیٰؑ پر واضح کر دیا تھا۔

أَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ

دیکھ میں نے تجھے اپنی رسالت کے لئے چُن لیا ہے بس جو کچھ وحی کیا جاتا ہے اسے غور سے سن،

اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝

میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی حاکم اور معبود نہیں میری ہی عبودیت اختیار کرو۔ میرے قانون کو غالب کرنے کے لئے صلوٰۃ قائم کرو۔

وہ صلوٰۃ کیا تھی جس کے قیام کو حضرت موسےٰ کی بعثت کی وجہ بیان کیا گیا۔ وہ صلوٰۃ یہ تھی۔

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (۲۰/۱۵)

(یاد رکھو تمہارے ہاتھوں سے ایک عظیم انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے۔ کہ وہ انقلاب جو اب تک غیر مرئی طور پر ارتقائی منازل طے کرتا چلا آرہا تھا، نکھر کر سامنے آجائے۔ اس انقلاب سے مقصود یہ ہے کہ ہر فرد اپنی محنت کے بھرپور نتائج حاصل کر سکے اور کوئی آدمی اپنی محنت کے پھل سے محروم نہ رہے۔ (لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ــ کا یہی مفہوم ہے)

اُمم سابقہ کی اس تاریخ کی رُو سے جو قرآن میں محفوظ ہے، نظامِ خداوندی سے مقصود یہ ہے کہ ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جس میں رزق کی فراوانی ہو۔ اور ایسے معاشرہ کے قیام کے لئے ایک خطۂ ارض کی ضرورت لاینفک ہے۔ حضرت موسےٰؑ کی صحرا نوردیاں اور ان کی تلاطم خیز داستانِ جہاد شاہد ہے کہ وہ ایک ایسے خطۂ زمین کی تلاش میں وقفِ اضطراب رہے، جہاں بنی اسرائیل کو آباد کیا جا سکے اور پھر وہاں وہ نظام قائم کیا جائے جس کے لئے اللہ نے ان کو مامور کیا ہے۔

مطالبۂ پاکستان

اب عہدِ حاضر کی تاریخ کو سامنے لایئے۔ اور سوچئے کہ آپ نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ اس مطالبہ کی ابتدا سر سید علیہ الرحمۃ نے کی تھی جب انہوں نے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کو کہا تھا۔

"اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ دونوں قومیں اب کسی کام میں بھی دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا یہ بغض اور عناد اُن ہندوؤں کے سبب سے ابھرتا جائے گا جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

اُس مردِ غازی کی پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک خطبہ کے دوران پاکستان کا منصوبہ پیش کر دیا۔ تحریکِ پاکستان کی جدوجہد کے سلسلہ میں علامہ مرحوم نے وفات سے ایک سال پہلے قائداعظمؒ کو ایک خط میں لکھا۔

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سو سال

سے اُن کی حالت مسلسل گرتی چلی جارہی ہے۔ لیگ کا مستقبل اس پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق رہیں گے۔ شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریقہ سے سمجھا جائے اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد قائداعظمؒ نے پاکستان میں مجوزہ نظام کے بارے میں ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ دہلی سیشن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رَو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ عوام کی محنت غصب کرنے کا جذبہ ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے۔ اگر پاکستان کا یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو اُن کا خدا حافظ۔ ہم اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا اشتراک صرف پاکستان کے نظریہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے اندر جو نظام قائم ہونا تھا وہ اُس پر بھی ہم آہنگ تھے۔ اور یہی وہ نظریہ ہے جسے پرویز صاحب اس شدومد سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت معاشی ہمواری تھی۔

ملک کے استحکام کا مطلب ملکی معیشت کا استحکام

آپ نے دیکھا کہ اسلامی نظام میں معاشیات کو کتنا دخل ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ کوئی ملک ہو، کوئی بھی نظام ہو، اس کی امن و سلامتی کا راز اس کی معیشت کے استحکام میں مضمر ہے۔ اُس کی خوشحالی کا دارومدار اس کی معاشی حالت پر ہے۔ اس کے باشندوں کی نشوونما کا انحصار اُس ملک کی معاشیات پر ہے۔ اور معاشیات کا انحصار ملک کے ذرائع پیداوار

(MEANS OF PRODUCTION) پر ہے۔ اور قرآن کی اصطلاح میں "خزائن الارض" پر ہے اور خزائن الارض سے پورا پورا فائدہ صرف اور صرف اُسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا جب وہ افراد کی بجائے قرآنی نظام کی تحویل میں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب نے معاشیات کو اولیں اہمیت کا حامل قرار دیا ہے اور قرآن کریم کے ان گوشوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کیا جن کا تعلق اسلامی نظام کی معیشت سے ہے۔ ان جواہر ریزوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بعنوان "نظامِ ربوبیت" میں انہوں نے ایک متعین پروگرام پیش کیا ہے ان سے پہلے ایسی کوشش کسی نے نہیں کی۔ تحریک طلوع اسلام کا عملی پروگرام اسی کتاب پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں نظامِ حیات کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ چونکہ اس پروگرام کے خطوط آپ کے رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ البتہ

نظامِ ربوبیت کیا ہے؟

محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں ان کا خلاصہ عرض کر دینا چاہتا ہوں فرماتے ہیں:۔

(۱) اس نظام کی رُو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ (اسے ربوبیت عامہ یعنے تمام نوعِ انسانی کی پروَرش سے تعبیر کیا جاتا ہے)

(۲) کوئی فرد بھوکا، ننگا یا بے گھر نہیں رہے گا۔ تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔

(۳) معاشرہ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ہر شخص کی تعلیم و تربیت، علاج معالجہ کا تسلی بخش اور بلا قیمت انتظام کرے۔ تعلیم و تربیت کا منشاء حصولِ علم کے علاوہ فرد کی ذات کا استحکام اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہوگا۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کا وجود فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوگا۔

(۴) ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے (قرآن کی رُو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے قرآنی معاشرے کی تحویل میں رہیں۔ تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے اس کو قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات تجویز کرتا ہے جو افراد کی معاشی ہمواری کا ضامن ہے۔ وہ اُس کا واحد حل یہ بتاتا ہے کہ تمام ذرائع آمدن، وسائل پیداوار، اور رزق کے سرچشمے

نظامِ اسلامی کی تحویل میں ہوں اور وہاں سے ہر چیز حسبِ ضرورت افرادِ معاشرہ میں مساویانہ تقسیم ہو۔ اس طرح کوئی فرد دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوگا۔

بقا کس نظام کو ہے؟

برادرانِ عزیز! تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں مقابلہ نظامہائے حیات کے مابین ہوتا ہے، نہ کہ ذاتی عقاید اور مذاہب کے درمیان — جو نظام امنِ عالم اور سلامتی کی ضمانت دیتا ہے۔ دنیا اُس کی طرف جھکتی ہے۔ آپ کے عقاید بظاہر کتنے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں جب تک آپ کے پاس انسان کی خوشحالی کے لئے ٹھوس نظام نہیں ہوگا آپ کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ جس نظام نے افراد کی ضرورت سے چشم پوشی کی وہ نظام کبھی پنپ نہیں سکا کیونکہ:

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

بقا اسی کو ہے جو بنی نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔

تجربہ گاہِ چین

مثلاً ایک بات یاد آگئی پچھلے برس پاکستان کے سابق وزیر تجارت جناب حمید الزماںؒ صاحب جب عوامی جمہوریہ چین کے دورہ سے واپس آئے تو انہوں نے چین کی خوشحالی کا خوب چرچا کیا۔ پھر ایک بیان میں انہوں نے یہ کہا کہ اگر اب میں چین گیا تو اس بات کا مطالعہ کروں گا کہ چین میں جرائم کس طرح ختم ہو گئے۔ ہمارے ہاں ایک بزرگ ماسٹر فقیر محمد صاحب تشریف لاتے ہیں وہ بزم کے رکن تو نہیں لیکن پابندی سے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس بیان کا تذکرہ کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے خیال میں چین میں جرائم ختم ہو جانے کی کیا وجوہات ہیں؟ میں نے کہا یہ معلوم کرنے کے لئے چین دوبارہ جانا محض تضیعِ اوقات ہے۔ اس کی وجہ تو بالکل ظاہر ہے۔ وہ یہ کہ چین نے اپنا معاشی نظام ہموار کر لیا ہے جس سے جرائم ختم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ جرائم ایک طرف افراطِ زر کی پیداوار ہوتے ہیں اور دوسری طرف محتاجی اور ناداری کے۔

دوسرا سوال

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں جو عام طور پر محترم پرویز صاحب کے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کے متعلق کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "کیا کبھی ایسا نظام قائم ہوا تھا جیسے طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے؟" اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اگر ہمارا ایمان ہے کہ حضور نبی اکرمؐ اور ان کے رفقاء کی زندگیاں اور اعمال قرآن کے مطابق تھیں تو ہمارے پاس اس حقیقت سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ ایسا نظام ضرور قائم ہوا تھا۔ اگر ہم تک اس کی شہادت نہیں پہنچی تو یہ تاریخ کا قصور ہے۔ جس نے صحیح واقعات ہم تک نہیں پہنچائے۔ مگر اس عدمِ ثبوت کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن ایسا نظام پیش

نہیں کرتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن حکیم وہ ضابطۂ حیات ہے جو ہر مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے اس لئے یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ ایسے نظام کے متعلق ہدایات اس میں نہ ہوں۔

قرآنی شواہد اب آیئے اُن تاریخی شواہد کی طرف جنہیں قرآن کریم نے محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ وہ تاریخی شواہد ہیں جنہیں بطور سند پیش کیا گیا ہے۔ کاش سوال کرنے والے ہماری بجائے کبھی قرآن کی بارگاہ سے پوچھتے۔ حضور کا زمانہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن ہمیں اس دور سے کہیں اور پیچھے لے جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۱۲/۳)

(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگزشتیں سناتے ہیں۔ اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو بھی اُن ہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگزشتوں سے) بے خبر تھے۔

تجربہ گاہِ مصر اس کے بعد قرآن اس قصہ کی مختلف کڑیاں بیان کرتے ہوئے اس مقام پر لے آتا ہے جہاں اصل واقعہ کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ مصر کے قید خانے میں بند ہیں۔ شاہِ مصر کو خواب آیا کہ سات گائیں موٹی تازی ہیں اور ان کو سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں۔ سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی ہوئی۔ بادشاہ خواب سے بہت پریشان ہوا۔ اہل دربار کوئی تعبیر بیان نہ کر سکے۔ وہاں ساقیوں کا ایک سردار بھی تھا جو کبھی حضرت یوسفؑ کے ساتھ قید میں رہ چکا تھا۔ اور اس کے خواب کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی تھی۔ وہ بول اٹھا۔ میں اس خواب کا نتیجہ بتلا دوں گا۔ مجھے ذرا قید خانہ تک جانے دو۔ وہ حضرت یوسفؑ کے پاس گیا۔ اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھی۔ حضرت یوسفؑ نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ خواب کی تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی بتا دی کہ

سات برس تک تم لگاتار کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ جب کاٹنے کا وقت آئے تو جو کچھ کاٹو اسے اس کی بالوں ہی میں رہنے دو۔ صرف اتنی مقدار الگ کر لیا کرو جو تمہارے کھانے کے لئے ضروری ہو۔ پھر اس کے بعد سات سال سخت مصیبت کے آئیں گے۔ اور وہ سب ذخیرہ کھا جائیں گے جو تم نے پہلے سے جمع کر رکھا ہوگا، مگر تھوڑا سا جو تم روک رکھو گے بچ جائے گا۔ پھر اس کے بعد ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب بارشیں آئیں گی۔ لوگ اس میں پھلوں اور دانوں کا عرق نکالیں گے (۱۲/۴۷-۴۹) (قرآنی فیصلے جلد سوم میں دیکھئے نظام یوسفیؑ)

یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس کے لئے ایک جامع منصوبہ (PLAN) کی ضرورت تھی کیونکہ ذرائع پیداوار تو عوام کی نجی تحویل میں تھے۔ ان کی روک تھام کیلئے اگر کوئی قدم حکومت کی طرف سے اٹھایا جاتا یعنی راشن یا کنٹرول نافذ کر دیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ لوگ ایسے حکم کو نہ مانتے۔ اس کی مثال موجودہ دور میں آپ کے سامنے ہے۔ حکومت گرانی یا کسی اور وجہ سے اشیاء کی تقسیم اور قیمتوں کی حدود مقرر کر دیتی ہے۔ لیکن اشیاء چونکہ افراد کی نجی ملکیت ہوتی ہیں۔ یہ افراد کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کریں یا نہ کریں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایسے احکام کی تعمیل نہیں کرتے۔ اشیاء منڈی سے نابود ہو جاتی ہیں۔ اور حکومت کا کنٹرول اور راشن سسٹم منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ چیزیں افراد کی ہوتی ہیں اور کنٹرول حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ جہاں ثنویت (DUALISM) ہو، نتیجہ ظاہر ہے۔

نسخہ کیمیا

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک اور صرف ایک حل تجویز کیا۔ اور وہ یہ کہ بعد از تحقیقات جب حضرت یوسفؑ کی عصمت کی تصدیق ہو گئی اور وہ شاہِ مصر سے ملے تو شاہِ مصر نے ان کی عظمت کا اقرار کرنے کے بعد اُن سے مشورہ طلب کیا۔ کہ یہ جو مصیبت اس خطۂ ارض پر آنے والی ہے اس کی روک تھام کیسے ہو؟ حضرت یوسفؑ نے جب دیکھا کہ وہ منزل آ گئی ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں تجارب کی ان گنت بھٹیوں سے گزار کر تیار کیا تھا۔ تو نظامِ ربوبیت کے عظیم منصوبہ کا ایک ایک گوشہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ بلا تامل فرمایا؛

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ۔ (۱۲/۵۵)

ملک کے حدود میں جتنے بھی وسائل پیداوار اور ذرائع آمدنی ہیں۔ ان کو قومیا (NATIONALIZE) کر میری تحویل میں دے دیجئے۔ کیونکہ مجھے ان کی حفاظت اور ان کے محاصل کے صحیح مصرف کا علم دیا گیا ہے۔

"خزائن الارض" ایک بڑی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں ہر وہ کاروبار اور شعبہ شامل ہے۔ جو آمدن کا ذریعہ ہو اور ان میں امّ الخزائن، زمین ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں ہر وہ محکمہ بھی شامل ہے جس کا تعلق مالیات اور اقتصادیات سے ہے۔

حُسنِ انتظام

قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لئے "خزائن الارض" کو میری تحویل میں دے دیجئے۔ اس لئے کہ ان کی حفاظت اور مصرف کا مجھے علم دیا گیا ہے۔ ان کو اپنی تحویل میں لینے اور قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا طریق عمل

اختیار کیا اُس کی تفصیل توراۃ میں اس طرح ہے :۔

"اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لئے کہ وہاں کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی۔ یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا۔ جمع کیا اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا۔ کہ ہم کو روٹی دو کہ ہم آپ کے ہوتے ہوئے کیوں مریں۔ کہ نقدی چُک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چُک گئی کہ میں تمہارے چوپایوں کے بدلے میں تمہیں دوں گا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کے پاس لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکریوں اور گائے بیل کے گلوں اور گدھوں کے بدلے اُن کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے اُن کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گزر گیا۔ وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا خرچ ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہمارے چوپاؤں کے گلے بھی لے لئے۔ سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو۔ اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لئے مول لے لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی۔ کہ کال نے ان کو نپٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اس نے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی۔ کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔ تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لئے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لئے ہے۔ کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو۔ اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لئے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے اور یوسفؑ نے

ساری مصر کی زمین کے لئے یہ آئین جو آج کے دن تک مقرر ہے۔ کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا۔ مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی"

(کتاب پیدائش۔ باب ۴۷)

اور محترم پرویز صاحب کے الفاظ میں :

"حضرت یوسفؑ نے جب علت مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمین حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آگئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہنچا دیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں اب یہ کاشتکار اپنی محنت کے ماحصل کے آپ مالک تھے۔ صرف پیداوار کا پانچواں حصہ حکومت کو دینا پڑتا تھا تاکہ اس سے مملکت کا نظام چل سکے۔ اب زمیندار کاشتکار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے اس طرح سے حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں۔ (قرآنی فیصلے)

آپ نے غور کیا کہ سرزمین مصر کس قدر شدید قحط سے دوچار تھی۔ اور یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت یوسفؑ کے حسن انتظام کی وجہ سے نہ صرف خطۂ مصر بھوک اور افلاس کے بحران سے محفوظ رہا بلکہ بیرونی ممالک کے لئے بھی وجہ نجات ثابت ہوا۔ کیونکہ تورات کے بیان کے مطابق اس وقت قریباً قریباً تمام ممالک قحط کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ کتاب پیدائش باب ۴۱ میں لکھا ہے۔

"اور سات برس سیتی کے جو زمین مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین گرانی ہوئی۔ پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی پر جب ساری زمین بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لئے فرعون کے آگے چلائی۔ فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسفؑ کے پاس جاؤ۔ وہ جو تمہیں کہے سو کرو۔ اور تمام روئے زمین پر کال تھا ..... اور مصر کی زمین پر کال بہت پڑا تھا۔ اور سارے ملک مصر میں یوسف کے مول لینے آئے۔ کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا"

نظام یوسفی کی ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ پہلے سات سالوں میں فصل باقاعدہ ہوتی رہی۔ اس میں سے ضرورت کے مطابق غلہ استعمال میں بھی آتا رہا اور ضرورت پوری کرنے کے بعد جو بچتا وہ جمع کر لیا جاتا اور سات

برس کے بعد گوداموں میں صرف وہ غلہ موجود تھا جو ضروریات پوری کرنے کے بعد بچا تھا۔ اب سات سال ایسے آگئے جن میں بچائے ہوئے غلہ سے اہلِ مصر کی ضرورت بھی پوری کی جاتیں تھیں اور بیرونی ممالک کے ہاتھوں بھی فروخت کیا جاتا تھا۔ پہلے سات سالوں میں صرف شدہ غلہ سے جو کمی واقع ہو جاتی تھی وہ کمی نئے سال کی فصل سے پوری ہو جاتی تھی۔ لیکن قحط کے دنوں میں غلہ صرف ہی ہوتا تھا۔ اضافہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ صرف پس انداز کیا ہوا غلہ بغیر ایک دانہ کے اضافہ کے ساتھ سات سال لگاتار اندرون ملک میں بھی استعمال ہوتا رہا اور بیرون ممالک کی ضرورت بھی پوری کرتا رہا۔ اس طرح سات سال کی فصل چودہ سال میں جن میں سات سال قحط سالی کے بھی ہیں، اہلِ مصر اور نواحی ممالک کے لئے خوراک مہیا کرتی رہی۔ اس طرح حضرت یوسفؑ کے ہاتھوں سرزمینِ مصر میں نظامِ ربوبیت قائم ہو گیا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۲/۵۶)

برادرانِ عزیز! قرآن نے صرف چودہ سال ہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس نظام کی بدولت زندگی کی کشتی متلاطم موجوں کے تھپیڑوں کو بادِ شُرطہ کے جانفزا جھونکے سمجھتی ہوئی ساحلِ مراد تک جا پہنچی وہ نظام یقیناً اپنی ہمہ گیر خوبیوں کے ساتھ مصر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی رائج ہو گیا ہو گا۔ یہی وہ مصر ہے کہ جب حضورؐ کے زمانہ میں اور بعد ازاں خلافتِ راشدہ کے وقت تمام ممالک میں غلہ کی شدید قلت تھی۔ تو یہیں سے حجاز اور دوسرے ممالک کو اونٹوں کے ذریعہ غلہ پہنچایا جاتا تھا۔ یہ اُس نظامِ ربوبیت کا صدقہ تھا جس سے مصریوں کو حضرت یوسفؑ نے روشناس کرایا تھا۔

آج بھی وہی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں

جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ایسا نظام کبھی قائم ہوا تھا جو طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب پیش کرتے ہیں اے کاش وہ عہدِ یوسفی کے نظامِ ربوبیت کو دیکھیں جس کی جزئیات تک قرآن کریم نے محفوظ کر دی ہیں۔ خود خدا اس عظیم واقعہ کی طرف یہ کہہ کر توجہ دلاتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ۔ (۱۲/۷)

جو لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ کیا کبھی نظامِ ربوبیت قائم ہوا تھا تو بلاشبہ اس قصہ میں جس کے مرکزی کردار یوسفؑ اور اس کے بھائی ہیں۔ اُن کے اس سوال کا جواب موجود ہے۔ انہی کے لئے نہیں بلکہ ہر متجسسِ حقیقت اور جویائے صداقت کے لئے اس قصہ میں بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

آج بھی وہ نسخۂ کیمیا قرآن کی دفتین میں بعینہٖ موجود ہے جسے دنیا آزما چکی ہے اور شفا حاصل کر چکی ہے۔ اگر آج بھی وہ نسخہ استعمال کیا جائے تو وہی نتائج برآمد ہوں گے جو عہدِ یوسفی میں تجربہ کا و مصر میں ہو چکے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب وہ سرزمین ہنگامی صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اگر معمول کے حالات میں ایسے نظام کو آزمایا جائے تو اس سے کہیں بہتر نتائج برآمد ہوں گے۔ یہی وہ نسخہ کیمیا دنظامِ ربوبیت ہے جسے محترم پرویز صاحب نے بیاض قرآن سے تجویز کیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا کی نظروں نے اسے دیکھا ہے اور اب بھی یہ دنیا اُسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں یہ کہتی ہوئی سرگرداں ہے کہ ؎

وہ جو ساتھ تیرے گزر گئی اُسی زندگی کی تلاش ہے

قوموں کی موت

لیکن برادرانِ عزیز! فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے بڑے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کسی قوم کا خون منجمد ہو جاتا ہے اور جوشِ کردار سرد پڑ جاتا ہے۔ قرآن نے قوموں کی اس کیفیت کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ موت ایسی ہوتی ہے جو زندگی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ حکیم الامت نے کہا ہے ؎

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

مردہ قومیں کسطرح زندہ ہوتی ہیں

مردہ قوموں کی از سرِ نو زندگی کو قرآنِ حکیم نے بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب حضرت ابراہیمؑ قوم کو راہِ راست پر لانے کی ہر کوشش کر چکے تھے۔ مگر قوم ان کے پیش کردہ دین پر کان نہیں دھرتی تھی۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ
بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ
ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ (۲/۲۶۰)

"(وہ وقت یاد رکھو) جب ابراہیمؑ نے عرض کیا، اے میرے نشو و نما دینے والے تو ایسی مردہ قوموں کو کیونکر زندہ کرے گا (اس پر پوچھا گیا) اے ابراہیمؑ! کیا تجھے اس بات پر یقین نہیں؟ عرض کیا میرا اس پر یقین محکم ہے۔ میں تو فقط اپنی سابقہ کارکردگی کا جائزہ لے کر آپ سے مزید ہدایات چاہتا ہوں تاکہ ہدایات پاکر اطمینانِ قلب کے ساتھ آگے بڑھوں۔ ارشاد ہوا کہ ایسی قوموں کے افراد پر کسی بلانے والے کی آواز کا اسی طرح اثر ہوگا جس طرح مثلاً تو چار پرندے لے۔ پھر تو اُن کو (TAME) کر لینے اس طرح پروردش کر کہ وہ پوری طرح تیرے ساتھ مانوس ہو جائیں۔ پھر ان چاروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف پہاڑوں پر متعین کر کے پھر دیکھ جب تو اُن کو بلائے گا وہ کسطرح تیری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے۔"

اور آگے بڑھیئے۔ ایک بلبل کے بچے کو پنجرے میں بند کر دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان ہو جائے گا۔ لیکن جب آپ اس کو باقاعدہ تربیت اور خوراک دیتے رہیں گے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ آپ بازار سے گزر رہے ہوں گے اور وہ بلبل آپ کے سر پر اڑتا ہوا جائے گا۔ پنجرے سے جس کی دیواروں سے وہ سر ٹکراتا تھا۔ اس کی مانوسیت کا یہ عالم ہوگا کہ آپ اسے پنجرہ دکھائیں گے۔ وہ دوڑتا ہوا آئے گا اور اُسے جنت سمجھتے ہوئے اس میں داخل ہو جائے گا۔ باز ایک خونخوار پرندہ ہے۔ آبادی کے قریب نہیں آتا۔ مگر جب اس کی تربیت کی جائے تو مانوس ہونا تو درکنار وہ انسان کے لئے شکار پکڑ کر لاتا ہے۔

متذکرہ قرآنی مثال بھی اسی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ وہ قوم جو حق کا پیغام دینے والوں کی تضحیک اور استہزاء کرتی ہے۔ جب اس کی مناسب تعلیم و تربیت کی جائے۔ تو جب بھی کوئی داعیٔ حق اس کو پکارے گا وہ لوگ زمین کے چاروں گوشوں سے اس کی طرف بھاگتے ہوئے آئیں گے۔ لیکن برادرانِ عزیز! جب قوم کے افراد کی صحیح تعلیم و تربیت نہ ہو وہ کس طرح حق کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ کس طرح قانونِ خداوندی کے دست و بازو بن سکتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے تمثیلی قصہ میں بیان کیا ہے۔ یعنی یہ انقلاب تعلیم و تربیت ہی کے ذریعے رونما ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی صحرانوردیاں اس پر شاہد ہیں اور سب سے بڑھ کر اسوۂ محمدی اس پر دلیل ہے۔ حضورؐ نے قوم کو کس طرح تیار کیا؟ قرآن کی زبان میں: يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۶۲/۲)

تعلیمی درس گاہ کی ضرورت

پاکستان کے معمارِ اول سر سید علیہ الرحمۃ نے اسی سنتِ نبویؐ پر عمل کیا اور علی گڑھ میں ایک تعلیمی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا نتیجہ پاکستان کی شکل میں برآمد ہوا۔ پاکستان تو حاصل ہو گیا۔ لیکن جس کام کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا، وہ کام ابھی باقی ہے۔ اور وہ کام ہے **نظامِ ربوبیت کا قیام** — جسے حضرت یوسفؑ نے قائم کیا اور جسے حضرت نبی اکرم خاتم المرتبت صلے اللہ علیہ وسلم نے آخری شکل دی — اور جس کے داعی آج عزم پرویز صاحب ہیں۔ سر سیدؒ نے علی گڑھ درس گاہ قائم کی تو پاکستان بنا۔ اب ایک ایسی درس گاہ کی ضرورت ہے جو ایسی جماعت تیار کر سکے جس کے ہاتھوں سرزمینِ پاکستان میں نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے۔

یہ درس گاہ ایسے طالب علم تیار کرے کہ:

(۱) پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے

اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے ۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔ وہ کون سی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے۔ اور

(۲)۔ دنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی، بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جس کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے۔ قرآن حکیم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نکتۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور اپنے ملک میں بھی دوسروں کی رہنمائی کر سکیں۔

ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید مثال پیش کر سکیں۔ اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرتِ نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ رکھیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

مردِ قلندر کا وارث

محترم پرویز صاحب اب عمر کے اُس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جس کا شدید تقاضا یہ ہے کہ اُن کا وارث مقرر کر دیا جائے۔ اپنے محسنِ اعظم کی تحسین و تحمید، اس کی پیش کردہ فکرِ قرآنی کی سپاس گزاری اور اُس پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ محترم پرویز صاحب کی زندگی ہی میں ان کا وارث مقرر کر دیا جائے ــــ لامحالہ ان کے وارث ایک یا دو اشخاص نہیں ہو سکتے بلکہ وہ درس گاہ ہی ہو سکتی ہے جو ایسی قوم تیار کرے جو فکرِ پرویز کی جیتی جاگتی تصویر نظر آئے۔ جن کے متعلق وہ علامہ اقبال کی زبان میں اکثر کہا کرتے ہیں :

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نورِ بصیرت عام کر دے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

ضمیمہ

اسے ضرور پڑھئے

حسب ذیل فہرست میں سے جو کتابیں آپ منگوانا چاہتے ہوں ان پر یہ نشان (✓) لگا دیں اور ٹکٹ چسپاں کئے بغیر یہ کارڈ حوالۂ ڈاک کر دیں اور کتابوں کی مجموعی قیمت کا دسواں حصہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ آپ کو بقایا قیمت اور (محصول ڈاک) بکا وی۔ پی آ جائے گا۔ لیکن اگر آپ کتابوں کی کل قیمت منی آرڈر کر دیں تو ڈاک خرچ ہم اپنی طرف سے ادا کر دیں گے۔

اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۸ روپے	سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	۸ روپے
اسلام کیا ہے؟ (سستا)	۴ ،،	،، ،، (جلد دوم)	۶ ،،
سلسبیل	۸ ،،	،، ،، (جلد سوم)	۶ ،،
قرآنی فیصلے (جلد اول)	۳/۲۵ ،،	الفتنۃ الکبریٰ	۶ ،،
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	۳/۲۵ ،،	فجر الاسلام	۸ ،،
قرآنی فیصلے (جلد سوم)	۳ ،،	لغات القرآن (جلد اول)	۱۵ ،،
انسان نے کیا سوچا؟	۱۲ ،،	،، (جلد دوم)	۱۵ ،،
من و یزداں	۱۰ ،،	،، (جلد سوم)	۱۵ ،،
ابلیس و آدم	۸ ،،	،، (جلد چہارم)	۱۲ ،،
شعلۂ مستور	۶ ،،	،، (پورا سیٹ)	۵۰ ،،
نظام ربوبیت	۴ ،،	اسلامی معاشرت	۳ ،،
بہار نو	۵ ،،	اسباب زوال امت	۱/۵۰ ،،
مقام حدیث	۴ ،،	مذاہب عالم کی آسانی کتابیں اعلیٰ ۵ روپے، سستا ۳ ،،	
عربی خود سیکھئے	۲/۵۰ ،،		

نام و پورا پتہ .....

.....

Regd. L. No. 9243
MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

کس طرح مرتب ہوئیں۔ کن کن مراحل سے گذریں۔ اور آج ان کی حالت کیا ہے

قیمت قسم اعلیٰ مجلد : پانچ روپے

چیپ ایڈیشن : تین روپے